شکیل اعظمی

اس عہد میں مشاعرے کا بازاری اور تھیٹریکل
بن جانا غزل کی تخلیقیت کے زوال کا باعث تو
ہے ہی، نظم کی حوصلہ شکنی کا سبب بھی ہوا ہے۔
نئی نظم کی صنف جس کی اُٹھان راشد اور میرا جی
کے ہاتھوں ہوئی اور جو مجید امجد، اختر الایمان
اور منیر نیازی جیسے شاعروں کی آماجگاہ رہی،
افسوس آج وہ اپنے سچے شاعروں کو کھوج رہی
ہے۔ دیکھا جائے تو ان حالات میں زیرِ نظر
مجموعہ نظم نگاری کی دنیا میں ایک خوشگوار
اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔
— پروفیسر گوپی چند نارنگ

پوکھر میں سنگھاڑے

شکیل اعظمی

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

شکیل اعظمی

نام کتاب : پوکھر میں سنگھاڑے
شاعر و ناشر : شکیل اعظمی
تعداد : پانچ سو
سرورق : شاہد علیگ
زیر اہتمام : روپ کمار راٹھوڑ، فیروز احمد

Pokhar Mein Singhade

Poetry by Shakeel Azmi

A-201, Malwani Ramkrishn, Plot No. 52, Mahada Complex,
Malwani, Malad (West) Mumbai-400095 (INDIA)
Email: shakeelazmi3@gmail.com Mob: 9820277932

Edition : 2014 ₹ : 200/-

ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۶
- رائی بک ڈپو، الہ آباد۔ 09889742811
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی۔ 011-23276526
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۴
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ۔
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد۔

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: (0) 9899706640, 9971775969 Email: arshiapublications@gmail.com

Composed at: ***Frontech Graphics***
Abdul Tawwab 9818303136

اے نانی! تیرے نام

جب تو مرنا تو اماں کی طرح غائب نہ ہو جانا۔ خواب ہی میں سہی مجھے نظر آتی رہنا۔ حالانکہ نیند سے میرا تعلق گہرا نہیں ہے لیکن تجھے دیکھنے کے لیے میں سونے کی کوشش کروں گا۔

◆

الماس، کائنات، التمش، صدف، شاذیہ اور عائشہ کے لئے

اس دعا کے ساتھ کہ مجھے بچپن سے اب تک جتنے دکھ ملے، خدا میرے بچوں کو اس سے زیادہ بہت زیادہ خوشیاں عطا کرے۔

◆

وہ جو اک گاؤں سہریا ہے، اُس کی یاد میں

جہاں میں پیدا ہوا، جہاں میری پرورش ہوئی، جس کی مٹی آج بھی میرے جسم سے لپٹی ہوئی ہے۔ جس کی یادوں کے جھونکے آج بھی جب آتے ہیں تو میرے سارے موسم بدل جاتے ہیں۔

شاعری جس درد کے بہاؤ میں لکھی جاتی ہے اسی درد کی روانی کا
پڑھنے والے کی آنکھ سے تقاضہ بھی کرتی ہے۔

شکیل اعظمی

فہرست

نظمیں

غزل نما نظمیں

شکیل اعظمی کی انوکھی کائنات

تمام مذہبی روایتوں میں آیا ہے کہ خدا نے زمین بنائی، سورج چاند ستاروں سے اُسے سجایا، نیلا آسمان، اُڑتے بادل، لہلہاتے کھیت، پھیلی دھرتی کی آغوش، برف، پہاڑ، سمندر، پھل پھول، باغ بغیچے، کھیت کھلیان، خدا نے دھرتی پر جنت بچھائی اور انسان کو اپنی شبیہ پر اُتارا اور اُسے حسنِ فراواں اور عشقِ سوزاں سے سرفراز کیا۔ یہ زمین و آسمان، سورج چاند ستارے، پیڑ پودے، جنگل، تاروں کی چمکتی آکاش گنگا، صدیوں سے یونہی چلتی آ رہی تھیں۔ جب تک انسان کی معصومیت برقرار تھی، فطرت کا حسن اور انسان سے اُس کا لگاؤ یوں ہی سچا اور کھرا تھا۔ مگر جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا، فطرت، زمین آسمان اور اُس کی برکتوں سے دور ہوتا گیا۔ خدا نے انسان کے قلب و روح میں محبت کی جوت جلائی تھی۔ انسان نے اس کو رسوم و عقائد کے لبادے میں لپیٹ دیا۔ دھرتی ایک تھی۔ ہم نے اس پر لکیریں کھینچ کر اُس کو بانٹ دیا۔ پھر بھی انسان جب تک دھرتی سے جڑا رہا، فطرت کی سادگی اور معصومیت سب کا زہر اُتارتی رہی۔ لیکن جیسے جیسے ترقی کی رفتار بڑھتی گئی، جگمگاتے شہر وجود میں آتے گئے۔ شہروں، دھرتی، دیہات، کھیت کھلیان، ندیوں، دریاؤں میں جو نامیاتی رشتہ اور اُن میں جو اندرونی ربط اور جو تناسب و توازن تھا اس میں دراڑ آنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کارخانے، ملیں،

سینیں، فلک بوس عمارتیں، دھواں چھوڑتی چمنیاں حاوی آتی گئیں اور انسان چھوٹا ہوتا گیا۔ ترقی کی اس برق رفتاری اور ریل پیل اور مادی وسائل کی ہائے و ہو میں انسان کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا، ساتھ ہی اپنی جڑوں سے دور ہوتا گیا اور فطری سادگی اور بے لوثی سے کٹتا چلا گیا۔ شہر گاؤں دیہات قصبات پر حاوی آتے گئے۔ فطرت سے توازن کا جو رشتہ تھا، وہ بیچ سے کہیں ٹوٹ گیا اور ایسا ٹوٹا کہ اب اس کے جڑنے کی کوئی صورت نہیں۔ انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ بربادی کا سب سامان موجود ہے۔ اب سوائے آگے بڑھتے رہنے کے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ انسان کی ازلی سادگی اور بے لوثی قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔ ایسے میں شکیل اعظمی نے اگر اپنے اندر کے فطری شاعر کی آواز سنی ہے اور لاشعور کی تہوں میں سوئے ہوئے بچپن، گاؤں دیہات، کھیت کھلیان، دادی، نانی، اماں اور گھر آنگن کے رشتوں کی جوت جگائی ہے اور اس بھولے بسرے بھید بھرے منظر نامہ سے زندگی کی ازلی سادگی اور بے لوثی کی تخلیقی بازیافت کی ہے تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ انوکھے باطنی تجربے سے ایک ایسا مجموعہ ہاتھ لگا ہے جو آئے دن کے چھپنے والے رسمی اور بازاری مجموعوں اور کھوٹے سکوں کے ہجوم میں نہ صرف سب سے ہٹ کر ہے، بلکہ ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جس کی بے لوثی کی جوت جگائے رکھنا نہ صرف سچی شاعری کی پہچان ہے بلکہ آج کی آلودگی سے بھری دنیا میں ضروری بھی ہے۔

شکیل اعظمی کی شاعری میں یوں بھی آڈمبر نہیں ہے۔ ان کا فطری شاعر مشاعرے بازی اور بکاؤ اور بازاری شاعری کے اس دور میں وہاں دکھائی نہ دیتا ہو ایسا ضروری نہیں ہے۔ لیکن بفضلہٖ وہ درسی نوعیت کے علم و فضل سے بوجھل نہیں ہیں، اس کا فائدہ بھی ہے اور خطرہ بھی، فطری شاعری مکتب مدرسے آکسفورڈ کیمبرج کو نہیں جانتی، علم و فضل اور عروض و بیان سے کوئی ناسخ و شاہ نصیر تو بن سکتا ہے، ناصر کاظمی یا ندا فاضلی نہیں۔

خطرہ یہ کہ سچی شاعری سود و زیاں کا کھیل نہیں، یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ 'اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں'۔ اگر شکیل اعظمی فقط وارث علوی یا میری تعریف پر اکتفا نہیں کریں گے، اور تنقید کی گرم بازاری اور رمی باہری پن کی نوعیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے نظام الدین اولیاؒ کے اس قول کو حرزِ جاں بنائیں گے کہ 'گھر مت بناؤ کہ دل آباد رہے' تو گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ ان کے اندر کا فطری شاعر زندہ ہے لیکن اس کے رفتہ رفتہ عصری، بازاری، میکانکیت کا حصہ بن جانے کے امکانات نہ ہوں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شکیل اعظمی اس کو جانتے نہ ہوں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا، لیکن نظیر کا 'آدمی نامہ' نظر میں رہے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ آدمی کو بگڑتے بھی دیر نہیں لگتی۔ آج کے حالات میں کسی فطری شاعر کا کھرا شاعر بنے رہنا اور سود و زیاں کے آگ کے دریا سے بے خطر گزر جانا اگر مشکل نہیں تو اتنا آسان بھی نہیں۔

شکیل کی ابھی کہانیاں سننے کی عمر ہوگی کہ ماں خون تھوکتی مر گئی۔ ماں کو جان لیوا مرض تھا۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ کھلونے ٹوٹتے بنتے رہتے ہیں، خدا نے آخری کھلونا بھی چھین لیا۔ ایسے میں فطرت اور گھر سے باہر کی دنیا سے لگاؤ کا بڑھنا فطری تھا۔ جہاں ایک رشتہ ٹوٹتا ہے وہاں کئی رشتے بن جاتے ہیں۔ فطرت گود کھول دیتی ہے۔ گھر، باہر، دھرتی، کھیت، کھلیان، پوکھر، پورا قصبہ ماں بن جاتا ہے۔ برگد کے پیڑ کی شاخیں اس کی جڑوں کی طرح دھرتی میں اُترتی ہیں پھر شاخیں بن جاتی ہیں۔ شکیل اعظمی نے بظاہر بچپن کی یادوں کو آواز دی ہے، لاشعور کی تہوں میں اُتر کے اپنے اندرون سے باتیں کی ہیں، یہ جڑوں کی طرف جھکنا بھی ہے۔ دھرتی میں پھیلی ہوئی ان جڑوں میں ہر جگہ اس معصومیت اور بے لوثی کی جھلک ہے جو انسانیت کا جوہر ہے اور جس سے آج کی برق رفتار زندگی روز بروز دور ہوتی جاتی ہے اور اس پر صارفیت کا زنگ چڑھتا جاتا ہے۔

یاد بجائے خود ایک تخلیقی جمالیاتی عمل بھی ہے۔ ان نظموں میں کہیں کہیں جادوئی لمس ہے تتلی کے پروں کی طرح جو ہاتھ میں آتا بھی ہے اور نہیں بھی آتا۔ لیکن سوندھی مٹی کی مہک ان میں ہر جگہ ہے:

پھر وہی میں، وہی تتلی، وہی جگنوں کا سماں
وہی ساون کی پھواریں، وہی کوئل کی صدا
وہی سردی، وہی گرمی، وہی برسات کی رُت
وہی صبحیں، وہی شامیں، وہی راتیں، وہی دن
وہی شہتوت، وہی نیم، وہی آم کے پیڑ
وہی امرود، پپیتے، وہی جامن کے درخت
وہی ٹپکے ہوئے مہوے، وہی املی کی کھٹاس
وہی کھیتوں سے چرائے ہوئے گنّے کی مٹھاس
وہی پوکھر میں سنگھاڑے، وہی مچھلی کا شکار
وہی چلتی ہوئی رہٹیں، وہی فصلوں پہ بہار
وہی تختی، وہی بستہ، وہی اسکول کے یار
وہی کھیلوں سے محبت، وہی پڑھنے سے فرار
بھر گیا رنگ سے احساس کا درپن میرا
ماں کی یاد آئی تو یاد آیا ہے بچپن میرا

(پوکھر میں سنگھاڑے)

ان یادوں میں اُڑنے والے سانپوں کے قصے ہیں، املی کی شاخوں پر جن کا بسیرا تھا، راتوں میں غائب ہو جاتے تھے، جانے کس کے گھر جاتے تھے۔ کالی ماں کا مندر تھا جس کے باہر چڑیلوں کا مسکن تھا۔ ڈاکو ڈاکے ڈالتے، چھتوں پر دھم دھم کرتے بکسوں

لوٹ رہے ہیں۔ [illegible] جو مارے حسد کے سب کے
سب مرجاتے ہیں۔ کتاب طاقچے پر دھری ہے جہاں اُجالا سیاہ کپڑے میں ہاتھوں کا منتظر ہے۔ ناند میں کھاتی بھینس آہٹ سے بدکتی بچے کو سینگوں سے ڈراتی ہے۔ ایسے میں بس اک نانی ہی سچی تھی:

تختی

بستہ
کھیل تماشے

بندر

بھالو

ہاتھی

گھوڑے

ساری دنیا جھوٹی تھی

بس اک نانی ہی سچی تھی

مرے لئے سب سے اونچی تھی

(نانی)

قصبے میں رنڈی کے ناچ کا اپنا مزہ تھا۔ چمچماتی پگڑیوں، تنی مونچھوں اور کھڑکتی لاٹھیوں کے بیچوں بیچ جب رنڈی ناچتی تھی تو منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا:

تو مت پوچھو

عجب ماحول ہوتا تھا

اِدھر اک غول ہوتا تھا

اُدھر اک غول ہوتا تھا

پتہ یا رقص کرتے وقت
کسی کی گود میں آکر
ذرا جو بیٹھ جاتی تھی
تو جیسے آگ لگ جاتی تھی مجمع میں
چمک اٹھتی تھیں تلواریں
گرج اٹھتی تھیں بندوقیں
ہوائیں کارتوسوں کی مہک گھل جایا کرتی تھی
ہمارے گاؤں میں پہلے بلا کے مرد ہوتے تھے

(زندگی کا ناچ)

ان نظموں میں گاؤں کے کتنے تماشے، حافظ جی کا ڈر، تیج تہوار، آتے جاتے موسم، بارشوں کا اودھم، سب کچھ ایک بھری پری طلسماتی دنیا کے ساتھ زندہ ہو جاتا ہے، جس کو ایک غمزدہ معصوم بچے کی آنکھ سے دیکھا گیا ہے۔ ان میں 'نوٹنکی' اور 'مداری' بالخصوص ایسی نظمیں ہیں جنھیں بار بار پڑھا جائے گا اور جن کی کشش کم نہ ہوگی۔ مداری محض بیانیہ نہیں۔ زندگی خود بھی تو ایک تماشہ ہے۔ کیا انسان نہیں چاہتا کہ منتر مارے، اور ایسا منتر مارے کہ سب تالی بجائیں، اس کے مطیع ہو جائیں اور گن گان کریں۔ کون ہے جو اس نظم کو دوبارہ پڑھنا نہ چاہے گا:

کندھے پر تھیلا لٹکائے
ہاتھ میں ڈمرو بنسی لے کر
گاؤں کے چوراہے پر جاؤں
بھیڑ لگاؤں
بھیڑ اکٹھا ہو جائے تو تھیلے سے
ڈبے

ڈی

تاش کی گڈی

کنکر پتھر

خونی خنجر

اور کئی سامان نکالوں

لوگوں کی نظروں کو باندھوں

چٹکی بھر کر دھول اُٹھاؤں

منتر ماروں

منتر مار کے

رسّی یا ٹائر پر پھینکوں

سانپ بناؤں

بچوں سے تالی بجواؤں

گاؤں کے سارے بچے میرے گن گائیں

چھوٹے چھوٹے ہاتھ مرے لمبے ہو جائیں

(مداری)

مداری، نوٹنکی، رنڈی کا ناچ، میری پسندیدہ نظمیں ہیں۔ دوسرے پڑھنے والوں کی دوسری نظمیں ہو سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ موسموں پر، بارش، دیوار اور کائی پر، سائیکل سے زخمی ہونے پر، مکتب، تختی، دُودھی کا لیپ لگانے پر، کچے رنگوں کے موسم میں پر، دیوار میں در پر، کئی نظمیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعض نظمیں نہایت ہلکی پھلکی بھی ہیں جن سے قاری سرسری گزر سکتا ہے۔ بیدل نے کہا تھا میرے یہاں سب مال دستیاب ہے سوائے خود فراموشی کے۔ شکیل اعظمی نے احساس کے درپن کو کھلا رکھا ہے،

جذبات سے مغلوب نہیں نہیں ہوئے اور فضابندی کا ہر جگہ خیال رکھا ہے۔ مختصر سے مختصر نظموں میں بھی فضابندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بہرحال مجموعے کا Core وہی نظمیں ہیں جن میں دھرتی کا سنگیت اور ازلی بے لوثی و بے نیازی اور بچپن کی موج و مستی کا رمز ہے، ملاحظہ ہو:

گرمی کا موسم ہے
باہر سویا ہوں
سورج کی ہلکی سی لالی
آکر مجھے جگاتی ہے
بستر چھوڑ کے
کھیت کی جانب جاتا ہوں
جھاڑے سے فارغ ہو کر
واپس آتا ہوں
بیلوں اور بھینسوں کو
چارہ دیتا ہوں
کھا چکتے ہیں جب تو کھول کے ناندوں سے
املی کے سائے کے نیچے لاتا ہوں
ان کے گندے پن سے نفرت کرتا ہوں
لیکن پھر اگلے ہی لمحے
دونوں ہاتھ سے ناک دبائے
بردوری میں گھس جاتا ہوں
ہاتھ پاؤں میں گوبر ہی گوبر ہوتا ہے
کھانچی کو گوبر سے بھر کر

تنہا ہی رکھتا ہوں سر پر

گھور تلک لے آتا ہوں

رستے بھر اُکلاتا ہوں

آخری کھیوے کے ہمراہ

میں بھی گھور میں گر جاتا ہوں

گوبر میں مل جاتا ہوں

میں بھی کھاد کا حصہ ہوں

(میں بھی کھاد کا حصہ ہوں)

یا وہ نظمیں جن میں آزادی و بے فکری کے زیاں کا احساس ہے کہ وہ اگلی سی باتیں اب کہاں، فطرت سے جڑیں کٹتی جا رہی ہیں، دھرتی سے انسان کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ کھلی فضا، نیلا آکاش، ازلی سادگی، آزادگی اور بے لوثی خواب و خیال ہو چکے ہیں۔ شہروں نے زندگی کو پوری طرح نگل لیا ہے:

مٹی کا گھر

گھر میں چولھا

چولھے میں اُپلے کا ایندھن

بھنے ہوئے آلو، گنجی کی

مہکی مہکی سوندھی لذت

نئے سال کے باسمتی کا

پکا ہوا تازہ رسیاول

توے سے اُتری گرم چپاتی

سونا پگھلا گُڑ کا بھیلا

گھی سے چمکی دال رکابی

سرخی مائل دودھ کٹورہ

چائے کا پیالا

اور پیالے میں

بھنا ہوا مکئی کا لاوا

بھیلی

چورا

لائی دانا

امی سانانی سا کھانا

کہاں گئیں وہ ساری چیزیں

جن میں میرا بچپن تھا

بچپن یوں بھی طلسماتی کیفیت رکھتا ہے۔ سب کو اس میں کہیں نہ کہیں اپنی جھلک نہ ملے ایسا ممکن ہی نہیں اور یہی شاعر کی کامیابی ہے۔ جو نظمیں مجھے اچھی لگیں میں نے اشارہ کیا ہے۔ دوسروں کو دوسری اچھی نہ لگیں اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔ اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے ایک الگ راہ نکالی ہے اور شعور و لاشعور نیز پوری سائیکی کو آواز دی ہے۔ کون کتنا اس آواز کو سنتا اور نہاں خانۂ دل میں اُتارتا اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ پڑھنے والے کی اپنی توفیق اور ذوق وظرف پر منحصر ہے۔

شکیل اعظمی کی پہچان غزل کے شاعر کی ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن کم کم۔ اس عہد میں مشاعرے کا بازاری اور تھیٹریکل بن جانا غزل کی تخلیقیت کے زوال کا باعث تو ہے ہی، نظم کی حوصلہ شکنی کا سبب بھی ہوا ہے۔ نئی نظم کی صنف جس کی اُٹھان راشد اور میراجی کے ہاتھوں ہوئی اور جو مجید امجد، اختر الایمان اور منیر نیازی جیسے شاعروں کی آماجگاہ رہی، افسوس آج وہ اپنے سچے شاعروں کو کھوج رہی ہے۔ دیکھا جائے تو ان

حالات میں زیر نظر مجموعہ نظم نگاری کی دنیا میں ایک خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پچاس سے زائد چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ آخر میں کچھ مسلسل غزلیں بھی در آئی ہیں۔ دراصل غزل صنف ہی ایسی ہے کہ جب شاعر کو پکڑ لیتی ہے تو باطن میں اتر جاتی ہے۔ بہرحال اس مجموعے میں نظمیں حاوی ہیں اور ان میں تخلیقیت کا جادو بھی خوب چلا ہے۔ بالعموم آزاد نظمیں ہیں لیکن روانی اور اندرونی آہنگ میں اگر کہیں قافیہ آ گیا ہے تو آ گیا ہے، معریٰ مصرعے ہو گئے ہیں تو ہو گئے ہیں، یہ فطری روانی اور بہاؤ تخلیقیت کا رمز ہے۔ نظمیں زیادہ تر اپنی تشکیل اور وحدتِ تاثر کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ تمام نظموں میں داخلی ربط اور اندرونی وحدت ہے، جس سے بچپن کا منظرنامہ حیرت زا تخلیقیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔
فراق گورکھپوری نے 'روپ' اور جاں نثار اختر نے 'گھر آنگن' میں گھریلو زندگی کی مرقع کشی کی تھی، لیکن یہ رباعیوں کے مجموعے ہیں، مزید یہ کہ عشق و محبت، حسن و نشاط، کیف و مستی اور گھر گرہستی کی بات دوسری ہے، اور بچپن کا کھلنڈرا پن، دکھ درد اور گاؤں دیہات قصبات کا زمینی پن بالکل الگ کیفیت ہے اور ان چھوا موضوع ہے۔ مقابلہ یوں بھی مقصود نہیں بڑوں کی بات بڑی ہے۔ تاہم شکیل اعظمی نے یک موضوعی نظموں کا بچپن نامہ لکھ کر ایک نئی راہ میں سبقت کی ہے۔ تاریخ میں دستخط ثبت کرنا منحصر کئی امور پر ہے، منجملہ اور باتوں کے سو باتوں کی بات جمالیاتی اثر ہے جسے وقت کی کسوٹی اپنے طور پر کستی ہے۔ شکیل اعظمی کی باطنی خلش، تخلیقی گداز اور حوصلہ مندی بہرحال لائقِ توجہ ہے کہ کساد بازاری اور کھوٹے سکوں کے چلن کے اس دور میں اس کے پاس الماس و گہر نہ سہی کچھ سچے اور کھرے مال سے اس نے دکان سجائی تو ہے، یہی کیا کم ہے!

۳ نومبر ۲۰۱۳ء (دہلی) — **پروفیسر گوپی چند نارنگ**

کبھی بچپن میں میرے ساتھ کنچے کھیلا کرتی تھی

میں اب بھی ہوں وہی بچہ، سیانی ہو گئی دنیا

(شکیل اعظمی)

ناسور سے بہا ہوا مواد

بچپن کے دُکھ انسان کے ساتھ پرانی کھاٹ میں کھٹمل کی طرح ہوتے ہیں۔ کھاٹ کو پانی میں ڈالو، دھوپ میں رکھو یا ڈنڈے سے پیٹو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کھٹمل رات میں بانوں اور چولوں سے نکل کر بستر پر رینگنے لگتے ہیں۔ گہری نیند کبھی سونے نہیں دیتے:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(غالب)

'پوکھر میں سنگھاڑے' کی نظمیں ایک ایسے بچے کی آپ بیتیاں ہیں جسے اس کی تپ دِق سے خون تھوکتی ماں اس عمر میں چھوڑ کر مر گئی جس عمر کا اُسے سال بھی معلوم نہیں۔ ماں کا وجود اب اس کی یادداشت میں اس قدر دھندلا ہو گیا ہے کہ وہ تمام تر ذہنی کوششوں کے باوجود ماں کو اس کے اصل پیکر میں تبدیل نہیں کر پاتا۔ ایسا کرتے ہوئے اس بچے نے بے شمار اندھی اور بوڑھی راتوں کو اپنے آنسوؤں کی روشنی میں صبح کی سڑک پار کرائی ہے۔ بدلے میں ان راتوں نے بچے کو ماں سے دوبارہ ملنے کی دعائیں دی ہیں۔ بچہ اس بے شکل ماں کو آج بھی کبھی کبھار خواب میں دیکھتا ہے اور دیکھتے ہی پہچان لیتا ہے کیونکہ ماں کی شناخت چہرے کی محتاج نہیں ہوتی:

رات ماں قبر سے آئی تھی مرے کمرے میں
میری آنکھوں میں چھپا کر کہیں جنت رکھ دی

ماں کے مرنے کے بعد باپ نے دوسری اور پھر تیسری شادی کر لی۔ مرنے سے پہلے نانی اور ماموں سے ماں کے لیے گئے وعدوں کے مطابق بچے کی پرورش ننھیال میں ہونے لگتی ہے۔ نانی کا ماموں، ممانی اور کئی پوتوں اور پوتیوں سے بھرا پُرا گھر ہے۔ گھر کے باہر بیٹھک اور پھر لمبا چوڑا صحن ہے۔ صحن میں کئی پشتوں سے سایہ دیتے املی کے دو پرانے اور آم کے گھنے درخت ہیں۔ درختوں سے لگ کر چاروں دشاؤں میں دائرہ بناتا ہوا ایک بڑا سا پوکھر ہے۔ جس کی مچھلیوں پر پورے گاؤں کے پرندوں اور انسانوں کے حقوق یکساں ہیں۔ جس کے کبھی ختم نہ ہونے والے پانی سے گاؤں اور اڑوس پڑوس کے جانور اپنے جسم کے اندر اور باہر کی پیاس بجھاتے ہیں۔ گاؤں کے بچے مچھلی کے بچوں کی طرح پوکھر میں اُترتے ہی تیرنے لگتے ہیں۔ گھر کی یہ کشادگی صحن تک ہی محدود نہیں، دور کھیتوں، کھلیانوں اور ٹیوب ویل تک پھیلی ہوئی ہے۔ انسانوں کے اس خاندان میں ایک بھینس اور دو بیل بھی آباد ہیں۔ بعض اوقات اس آبادی میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ گھر کے ایک حصے میں مرغیوں اور بطخوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اس گھر کی چہل پہل میں خالاؤں اور اُن کے بچوں کی آمد و رفت کی بھی حصے داری ہے۔ اسی گھر کی دیوار سے لگا ہوا لیکن ذرا الگ ایک مکان بڑے نانا، چھوٹے ماموں، ایک اور خالہ اور کچھ ننھے منے بچوں سے روشن ہے۔ اس خوشحالی میں ماموں کے خون پسینے سے پیدا کئے گئے اناج کی چمک اور سنگاپور رہنے والے نانا کی محنت سے کمائے ہوئے پیسوں کی رونق بھی شامل ہے۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی بچے کی یتیمی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ ننھیال ماں کا مائکہ ہو کر بھی بچے کا گھر نہیں بن پاتا۔ ممانی کی محبت اور ماں کی ممتا میں فرق ہوتا ہے۔ ماموں کے ہاتھ میں باپ کے ہاتھ جیسا سایہ نہیں ہوتا۔ ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائی بہنوں میں سگے بھائی بہنوں جیسی اپنائیت نہیں ہوتی۔ نانی جب

بوجھ سی ہو جاتی ہے تو اپنا ہی گھر اس پر تنگ ہونے لگتا ہے۔ اور پھر شروع ہوتا ہے بچے کی محرومیت کا سلسلہ، جو دو پیسے کی سنترہ مٹھائی سے سیکڑوں روپیوں کی سائیکل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس مجموعے کی زیادہ تر نظمیں اسی محرومی کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ اس بچے کی کھلونوں کے ساتھ کھیلنے کی عمر ہے۔ لیکن حالات نے اسے بڑوں سے زیادہ حساس، سنجیدہ اور سمجھدار بنا دیا ہے۔ اسے صبر و برداشت کی عادت ہوگئی ہے۔ وہ چیزوں کے لیے ضد نہیں کرتا۔ جانتا ہے کہ اس کی ضد پوری نہیں کی جائے گی۔ اسے گھر کے لوگوں کا بہت کچھ کہا سنا برا لگتا ہے لیکن وہ برا لگنے کا اظہار کسی سے روٹھ کر نہیں کرتا۔ جانتا ہے کہ روٹھا تب جاتا ہے جب کوئی منانے والا ہو۔ لاڈ، پیار اور دُلار جیسی خواہشیں اس میں جنم تو لیتی ہیں مگر پروان چڑھنے سے پہلے ہی مر جاتی ہیں۔ وہ اپنے دُکھ بانٹتا نہیں، سینے میں ناسور نام کے صندوق میں جمع کرتا رہتا ہے۔ نانی اس کے ہر زخم کا مرہم ہے۔ لیکن نانی کے سامنے بھی وہ کبھی روتا نہیں۔ جانتا ہے کہ نانی کو تکلیف ہوگی۔ اس لیے چھپ کے تنہائی میں روتا ہے۔ اس بچے کی بہت ساری کچی پکی نظمیں آنسوؤں میں کھو گئیں۔ یہ نظمیں تو اس درد کی تخلیق ہیں جو ناسور میں محفوظ رہ گیا تھا۔ ناسور اب پھوٹا ہے تو مواد باہر کی طرف بہہ نکلا ہے۔

ابا پہلی سوتیلی ماں کو طلاق دے چکے ہیں، کیونکہ اس کی نگاہ اُن کی جائیداد پر تھی۔ دوسری کی نظر سے بھی وہ خوب واقف ہیں۔ مگر کیا کریں تنہائی کہیں نہ کہیں آباد ہونا چاہتی ہے۔ کہانی کردار کے بغیر نہیں چلتی۔ اور جب کہانی خیالی نہ ہو، زندگی کی ہو، تو کردار اپنی مرضی سے نہیں گڑھے جاتے۔ وہ اپنا حلیہ، اپنی زبان، اپنا مزاج، چال چلن اور مقصد خود طے کرتے ہیں۔ سو کہانی کسی صورت چل رہی ہے۔ کہانی کیا ہے، مجبوری ہے۔ رشتہ تو بن گیا لیکن رشتے میں محبت اور ایمانداری نہیں ہے۔ ایک ہی کہانی میں رہتے ہوئے دونوں کردار الگ الگ کہانی کے معلوم ہوتے ہیں:

محبت تھک چکی لیکن اسے رشتہ چلاتا ہے
ابھی ٹھہرے ہوئے کردار کو قصہ چلاتا ہے

ابا نے اماں کے مرنے کے بعد بھی اپنی پرانی سسرال سے رشتہ نہیں توڑا۔ ان کے گاؤں کا نام 'سیدھا سلطان پور' ہے، جو بچے کے ننھیالی گاؤں 'سبریا' سے تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ فاصلہ وہ اب بھی کبھی کبھار اپنے قدموں سے طے کرتے رہتے ہیں۔ اتنی زمین چلنے کے لیے وہ سواری کو زحمت نہیں دیتے۔ وہ بھی ماموں کی طرح زمیندار ہیں۔ اپنے کھیتوں اور آم کے باغ کی دیکھ ریکھ کے بعد جو وقت بچتا ہے اسے وہ بھینسوں پر خرچ کرتے ہیں۔ بھینس پالنا اور ان سے محبت کرنا ان کا مشغلہ بھی ہے اور آمدنی کا ذریعہ بھی۔ بھینسوں سے ان کا لگاؤ یکطرفہ نہیں ہے۔ بھینسیں بھی ان سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں اور وہ بھی ان کی جائداد پر نظر رکھے بغیر۔ وہ بھینسوں کی تلاش میں جب اس طرف کو نکلتے ہیں تو لگے پاؤں سسرال بھی ہو لیتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں جب آم پکنے لگتے ہیں تو ابا آٹھ دس مزدوروں کے ساتھ اپنے باغ کے آم بھی لے آتے ہیں۔ سوتیلی ماں کے آنے کے بعد بھی آم آتے رہتے ہیں لیکن مزدوروں کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ نانی آج بھی ان کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ ماموں کے ساتھ بھی بیل، بھینس اور کھیتی باڑی پر ان کی خوب باتیں ہوتی ہیں۔ ابا بچے کو جب اپنے ساتھ لے جانے کی ضد کرتے ہیں تو نانی یہ کہہ کر ٹال دیتی ہیں کہ بڑا ہو جائے گا تو لے جانا۔ ابا جب تک سسرال میں ہوتے ہیں بچہ اُن کے پاس ہی رہتا ہے۔ ان کے لیے پانی لاتا ہے، گھر سے بنوا کر پان لاتا ہے۔ ان کے پاؤں دباتا ہے۔ جاتے وقت کبھی خود سے، کبھی نانی کے لعن طعن کرنے پر وہ بچے کے ہاتھ پر کچھ ریزگاریاں رکھ دیتے ہیں۔ یہ ریزگاریاں کئی دنوں تک غلک میں بجتی ہیں، اور پھر دکان پر جا کر ٹافیوں اور کھلونوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بچہ جب تھوڑا بڑا ہوتا ہے تو ابا

ایک مرتبہ اُسے اپنے گاؤں لے جاتے ہیں۔ اپنی طرح پیدل۔ راستے میں پڑنے والے ہر گاؤں میں کئی لوگ ابا کو پہچانتے ہیں۔ ابا رُک رُک کر فخریہ انداز میں سب سے بچے کا تعارف کرواتے ہیں۔ ساتھ میں بچے کے چھوٹے بھائی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ لوگ بچے کو کھاجا، بھیلی، لائی، چورا اور مٹھائیاں کھلاتے ہیں۔ یہ تجربہ بچے کے لیے انوکھا بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ یہ سبھی گاؤں ہندوؤں کے ہیں۔ ابا کے تعلقات دور دور تک ہندوؤں کے ساتھ بہت گہرے ہیں۔ بچہ ابا کے ساتھ جب گھر پہنچتا ہے تو شام ہو چکی ہوتی ہے۔ دروازے پر تالا ہے۔ سوتیلی ماں گاؤں ہی میں اپنے مائکے کے ایک رشتہ دار کے یہاں گئی ہوئی ہے۔ یہاں بھی گھر سے لگا ہوا بڑا سا بیٹھک ہے۔ جس میں دو تین چارپائیاں پڑی ہیں۔ ایک کونے میں بھینس بندھی ہوئی ہے۔ ابا بھینس کو چمکارتے ہیں۔ بھینس بھی اپنے انداز میں اُن کے پیار کا جواب دیتی ہے۔ دوسرے کونے میں ایک کتیا اونگھ رہی ہے۔ ابا کی آشنا آہٹ سے وہ کھڑی ہو کر دُم ہلانے لگتی ہے۔ اور بچے کی اجنبیت کو شک کی نگاہ سے گھورتی ہے۔ دوسرے کونے سے ذرا ہٹ کر گھر کا دروازہ ہے۔ ابا جیب سے کنجی نکال کر دروازے کا تالا کھولتے ہیں۔ اچھا خاصا مکان ہے۔ ایک لمبا چوڑا آنگن ہے جس میں لیمو، امرود اور پپیتے کے درخت ہیں۔ بچے کو یہ سب اچھا لگتا ہے۔ ابا بچے کو بالائی والا سرخ دودھ اور چاول کھلاتے ہیں۔ بچہ مزے سے کھاتا ہے اور سفر کی تھکان کی وجہ سے جلدی سو جاتا ہے۔

بچہ ابا کے ساتھ صبح تڑکے ہی اُٹھ جاتا ہے۔ ابا بھینس کی ناند میں چارہ ڈالتے ہیں۔ بھینس کے بچے کو اس کے تھن سے جدا کر کے کھونٹ میں باندھتے ہیں۔ بالٹی کے پانی سے تھن کو دھوتے ہیں اور دودھ دوہنے لگتے ہیں۔ مٹ میلے اُجالے میں دودھ کی سفید دھاریاں چاندی کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بچہ تھوڑے فاصلے سے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ بھینس بچے کی موجودگی سے خوش نہیں ہے۔ اپنی ناراضگی کا اظہار وہ

بچے کی طرف سینگوں کے ذریعہ سر جھٹک کر کرتی رہتی ہے۔ دودھ دوہنے کے بعد ابا گوبر کی کھانچی سر پر رکھ کر کھیت کی طرف نکل جاتے ہیں۔ بچہ بھی ان کے ہمراہ ہو لیتا ہے۔ اپنا کھیت، کھیت میں اپنے آم کے پیڑ اور دادا کے ہاتھوں کھودا ہوا اپنا کنواں دیکھ کر پہلی بار بچے میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ ایسی خود اعتمادی، جو اس کے وجود میں دور تک پھیلی ہوئی محرومی پر کچھ دیر کے لیے حاوی ہو جاتی ہے۔ کھیت میں اسے امرود کا ایک ننھا سا پودا نظر آتا ہے۔ اس پودے کے آس پاس کی مٹی کو وہ اپنے ناخنوں سے گولائی میں تراش کر جڑ اور مٹی کے ساتھ زمین سے الگ کرتا ہے۔ ابا کے ساتھ جب وہ گھر آتا ہے تو آنگن میں چولہے کے پاس ایک عورت ناشتہ کر رہی ہے۔ یہ اس کی سوتیلی ماں ہے۔ سوتیلی ماں بچے کو دیکھتی ہے۔ بچہ اس کی نگاہوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ناشتہ کر کے ایک کمرے میں جاتی ہے۔ کسی بات پر ابا کے ساتھ اس کی تکرار ہوتی ہے۔ تکرار جیسے جیسے بڑھتی ہے، دونوں کی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ بچہ ان آوازوں سے ڈر جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں تھمے امرود کے پودے کی جڑوں سے چھوٹ کر مٹی بھر بھر نیچے فرش پر گرنے لگتی ہے۔ سوتیلی ماں ایک جھٹکے سے کمرے سے نکلتی ہے اور گھر کا دروازہ کھول کر باہر چلی جاتی ہے۔ وہ پاس کے کسی گاؤں کے اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہے۔ سوتیلی ماں کے چلے جانے کے بعد بھی اس کا غصہ بہت دیر تک گھر کے سناٹوں میں گونجتا رہتا ہے۔

سوتیلی ماں جب شام کو گھر آتی ہے تو آنگن میں بچے کے لگائے ہوئے امرود کے پودے کو اُکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ اور اس بلا وجہ کے کام پر اسے خوب ڈانٹیں سناتی ہے۔ بچے کو آج کی رات آنگن میں اپنی کھاٹ سے نظر آنے والے چاند ستارے اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے چاند کے پاس سے گزرتے بادلوں کے بنتے بگڑتے چہروں میں اپنی ماں کو ڈھونڈتے ہوئے سو جاتا ہے۔ اگلے دن وہ

آنگن میں پڑے امرود کے پودے کو دھوپ میں مرجھاتے ہوئے کئی بار دیکھتا ہے۔ اس کے وجود میں دور تک پھیلا ہوا محرومی کے برگد کا سایہ ایک بار پھر اس کی پنپتی ہوئی خود اعتمادی کو نگل جاتا ہے۔ بچے کی اُداسی اور اس کے عدم تحفظ کا احساس روز بروز بڑھنے لگتا ہے۔ اب ابا کے گھر، کھیت، باغ، گاؤں اور گاؤں کی گلیوں میں اس کا جی نہیں لگتا۔ وہ نانی کے پاس جانا چاہتا ہے۔ ابا اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ ایک دن ابا بچے کو گھاس کاٹنے کے لیے کھانچی اور درانتی دیتے ہیں۔ بچہ اپنی اوقات بھر گھاس کاٹ کر لاتا ہے۔ کھانچی اور درانتی کو بیٹھک میں چارپائی کے پیچھے چھپا کر ابا کو بتائے بغیر نانی کے پاس واپس بھاگ آتا ہے۔ اور کافی دنوں تک ابا کے گاؤں نہیں جاتا۔

ننھیال میں پرورش پانے والا میں کوئی پہلا یا آخری بچہ نہیں ہوں۔ ایسے ماحول میں بہت سارے بچے پروان چڑھے ہوں گے۔ میرا چھوٹا بھائی حسنین نزدیک کی مثال ہے۔ تو میں ان بچوں سے مختلف کیوں ہوں؟ میرے احساسات میں اس قدر شدت، جذبات میں اتنی تیزابیت اور آنکھوں کے پانی میں اتنا کھارا پن کیوں ہے؟ ان سوالوں کے جواب میری نظموں میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ان نظموں کی فضا سے دردمندانہ رشتہ قائم کیا جائے اور اسی ہم رشتگی کے ساتھ نظموں میں گہرائی تک اُترا جائے۔ کیونکہ شاعری جس درد کے بہاؤ میں لکھی جاتی ہے اسی درد کی روانی کا پڑھنے والے کی آنکھ سے تقاضہ بھی کرتی ہے۔

کتاب پریس میں جانے سے ذرا پہلے نظر ثانی کے دوران میں ایک بار پھر اسی تخلیقی کیفیت کی سرشاری سے گزرا ہوں نتیجتاً مسودے میں کچھ نئی نظموں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ان میں میلہ، ناظم تائی کا چھرا، شیطانوں کے جمگھٹ، مینڈک کی آواز، بہت بارش ہوئی تھی، پیسہ بڑا مہنگا تھا، کھیلوں کی دنیا، احساس ہی دُکھ ہے، کبڈی، ڈبلا پکڑ، والی بال، غلیل سے کام نہیں بنے گا، عید، املی کے پھول، سہریا، سیدھا سلطان پور خاص نظمیں

ہیں۔ 'ماں کی ادھوری کہانی خواب میں بھی مکمل نہ ہو سکی' پرانی نظم ہے جسے موضوع کی مناسبت سے عنوان بدل کر مجموعے میں شامل کرلیا ہے۔ نظموں کی طرح اس مضمون کا بیانیہ بھی ایک ایسے پُرلطف درد کی لہر سے وابستہ ہے، جس کا احساس زخم بھر جانے کے بعد بھی زخم کو ہرا رکھتا ہے اور مزہ دیتا ہے۔ میں اپنے زخموں کی شاداب اور دکھوں کی اس سرسبز فضا میں اپنی ذات اور کائنات کے آسمان بھر اُڑنے اور آنکھوں سے بہتے جھرنے کی موسیقی میں درد کی بہار کا گیت گنگنانے کے لئے اپنی محفلِ تنہائی میں آپ کو شریک کرتا ہوں اور بناوٹی چہروں کے ہجوم اور جھوٹی ہنسی کی دھوم میں اپنے ساتھ سچے آنسو رونے کی دعوت دیتا ہوں۔

یکم دسمبر ۲۰۱۳ء، (ممبئی)

— شکیل اعظمی

پوکھر میں سنگھاڑے

شہر سارا مجھے لگنے لگا آنگن میرا
ماں کی یاد آئی تو یاد آیا ہے بچپن میرا
کوئی کہنے لگا پریوں کی کہانی پھر سے
پھر سے شہزادوں کے مانند ہوا من میرا
پھر وہی میں، وہی تتلی، وہی جگنوں کا سماں
وہی ساون کی پھواریں، وہی کوئل کی صدا
وہی سردی، وہی گرمی، وہی برسات کی رُت
وہی صبحیں، وہی شامیں، وہی راتیں، وہی دن
وہی شہتوت، وہی نیم، وہی آم کے پیڑ
وہی امرود، پپیتے، وہی جامن کے درخت

وہی ٹپکے ہوئے مہوے، وہی املی کی کھٹاس
وہی کھیتوں سے چرائے ہوئے گنّے کی مٹھاس
وہی پوکھر میں سنگھاڑے، وہی مچھلی کا شکار
وہی چلتی ہوئی رہٹیں، وہی فصلوں پہ بہار
وہی تختی، وہی بستہ، وہی اسکول کے یار
وہی کھیلوں سے محبت، وہی پڑھنے سے فرار
بھر گیا رنگ سے احساس کا درپن میرا
ماں کی یاد آئی تو یاد آیا ہے بچپن میرا

ٹی بی

مرض ہے یہ ہماری اس صدی کا ایک معمولی
مگر پہلے یہی اک بھوت تھا
جس کے بدن پر
سرخ دھبے تھے
دھنسی آنکھیں
اُن آنکھوں کے تلے
پچکے ہوئے رخسار
ہتھوڑے کے نشاں
جیسے کباڑی کے یہاں
المونیم کے برتنوں پر ہوں
نکیلے پیلے پیلے دانت
جن کے ساتھ

نہ کوئی پیسٹ

نہ کوئی برش

نہ کوئی دنت منجن تھا

وہ اک ڈھانچہ تھا

جس کی سب رگیں

بے جان تھیں

اور بے راوں تھیں

کہ جیسے گرمی کے موسم میں ندیاں سوکھ جاتی ہیں

مگر اس ڈھانچے کی ہڈی سے اکثر خون بہتا تھا

پیا تھا جانے کتنا خون لوگوں کا

یہی وہ بھوت تھا

جس نے

مری ماں کو جھنجھوڑا تھا

لہو اُس کا نچوڑا تھا

میں میری ماں اور ٹی بی

ماں نے پھر لہو تھوکا
اور مجھ کو یوں دیکھا
جیسے پھر نہ دیکھے گی
پھیپھڑوں میں اندر تک
زخم کُھل گئے تھے سب
کھانسیوں کے رکنے تک
سانس کے ٹھہرنے تک
سرخ اک نشانی ہے
درد کی کہانی ہے
خون تھوکنے والے
موت کی نگاہوں کی
سازشیں سمجھتے ہیں
اور اس کے آنے کی
آہٹیں سمجھتے ہیں
ماں نے اس گھڑی مجھ کو
حسرتوں سے دیکھا تھا
پھر خدا کو دیکھا تھا

خون تھوکتی ماں کی ادھوری کہانی

آدھی رات
اور ڈراؤنا کمرہ
اک روتی سی لالٹین کا
کٹا پھٹا بدرنگ اُجالا
بچے کی ضد
ماں کی ممتا
ایک کہانی
راجہ رانی
اُکھڑی سانسیں
خون کی کھانسی
چلتے چلتے راجہ رانی
رستے میں رکنے لگتے ہیں
لالٹین بجھنے لگتی ہے
بجھتے بجھتے بجھ جاتی ہے

ماں کے انتقال کے بعد

اللہ جی!

ہم سو نہیں پاتے

امی کو کب بھیجو گے

نانی کہتی ہیں تم ہم سے روٹھے ہو

لیکن اب ہم روزانہ مکتب جائیں گے

تم کو تختی پر لکھیں گے

اسلم اور مسٹر گندے ہیں

ان کے ساتھ نہیں کھیلیں گے

اللہ جی اب مان بھی جاؤ

چاہو تو امی کے بدلے

ہم سے ساری چیزیں لے لو

گیند بھی لے لو اور گولی بھی

لٹو اور غلیل بھی لے لو

لیکن ہم کو امی دے دو

ہم کو ہماری امی دے دو

املی کے پھول

املی کے نیچے کا رستہ
املی کے پھولوں سے سج کر
صبح سویرے یوں لگتا ہے
جیسے دوپٹہ ہو امی کا
کل سو کر جلدی اُٹھوں گا
لوگوں کے چلنے سے پہلے
املی کے سارے پھولوں کو
ڈلیا میں چن کر رکھوں گا
پھر امی کی قبر پہ جا کر
ان پھولوں کو رکھ آؤں گا
امی نیا دوپٹہ اوڑھے
میرے خوابوں میں آئے گی

ماں کی ادھوری کہانی خواب میں بھی مکمل نہ ہو سکی

مری ماں!
قبر سے گھر آ گئی ہے
در و دیوار روشن ہو گئے ہیں
چھتوں سے جھولتی مکئی کی بالیں چہچہاتی ہیں
مری نانی بہت خوش ہیں
مٹھائی بانٹتی ہیں
مٹھائی جو بدائی میں فرشتے لے کے آئے ہیں
ممانی چولھے پہ بیٹھی ہوئی ہیں
مرا کھانا نکالا جا رہا ہے
میں ماں کی گود میں بیٹھا کہانی سن رہا ہوں

ٹرمیل سے پہلے

سڑک پر بھونکتے کتوں کی آوازیں

مرے کانوں میں چبھتی ہیں

میں ڈرتا ہوں

جھجکتا ہوں

جلا کر بلب کمرے سے اندھیرے کو بھگاتا ہوں

کھلی آنکھوں سے خود کو دیکھتا ہوں

اور روتا ہوں

نہ میرا گاؤں ہے

نہ گھر ہے

نہ مکئی کی بالیں ہیں

فرشتے ماں کو واپس قبر میں دفنا چکے ہیں

یہاں کوئی نہیں ہے

صرف میں ہوں

میرا کمرہ ہے

کہانی کا ادھورا پن

مری آنکھوں میں بکھرا ہے

آخری کھلونے کا ماتم

میں سوتیلا بیٹا اپنے باپ کی تیسری بیوی کا
ان تینوں میں پہلے میری ماں آئی
ماں نے مجھ کو جنم دیا
لیٹا
بیٹھا
کھڑا ہوا دیوار پکڑ کر
چلنا جب آیا تو ماں کو روگ لگا
میرے کھلونے سستے اور مٹی کے تھے
کھیل کھیل میں ٹوٹ گئے
باری باری سب کی خاطر رویا میں
لیکن ماں کے مرنے پر میں رویا نہیں
ٹوٹا تھا اور بکھرا تھا
جیسے میرے کھلونے ٹوٹے بکھرے تھے
میرا بچپن میرا آخری کھلونا تھا
جس کی کرچیں اب بھی مجھ میں چبھتی ہیں
اور ٹوٹنے کی آوازیں گونجتی ہیں

بارش دیوار اور کائی

میں کیا جانوں ماں کی ممتا

کیا ہوتا ہے باپ کا پیار

گھر کی مٹی کی خوشبو انجانی سی

اینٹیں

دیواریں

کوٹھے

بیگانے سے

ناند میں کھاتی بھینس

مری آہٹ سے بدکے

اور سینگوں سے مجھے ڈرائے

دروازے پر بیٹھی لنگڑی کتیا سمجھے چور مجھے

بستر چادر اور تکیے کے رنگ جدا

میری گولی اور لٹو کے رنگوں سے

میرے پلنگ سے دکھنے والے

چاند ستارے نامانوس

گلی کے اندر کھیل رہے بچوں کی طرح

[illegible]

دور بہت میرے ہاتھوں سے

روٹی کی گنتی

چاول کے حصے

چیزوں کے ٹکڑے

سوتیلی ماں آپا یا خالہ ہوتی ہے

اس کی باتوں سے پتھر ہلکے ہوتے ہیں

گالی کی نزدیکی میں دوری ہوتی ہے

باپ کی لیکن بات ذرا سی

دل کے اندر جم جاتی ہے

چھاتی پر اک بوجھ کی صورت تھم جاتی ہے

راتیں جاگتی رہتی ہیں دن سوتا ہے

شور گلی میں روتا ہے

کچھ بے برسے بادل

ماموں کی
یا گھر والوں کی
باتیں سن کر
خاموشی سے اک کمرے میں جاتا تھا
چھپ کے جی بھر روتا تھا
امی کی یاد آتی تھی
ابا سے نفرت بڑھتی تھی
بارش تھم جاتی تھی تو باہر آتا تھا
دل کے اندر کچھ بے برسے بادل لے کر

جب بڑے نانا نے مجھے پالتو کتّا کہا

کھیل کھیل میں
ہار جیت میں
ماموں کے لڑکے سے جھگڑا
باتیں
گالی
ہاتھا پائی
دھیرے دھیرے بڑھی لڑائی
بیچ میں آیا گھر کا بوڑھا
بوڑھے نے دونوں کو ڈانٹا
پھر مجھ کو اک نام دیا
پالتو کتے!
تو نے اپنے مالک کو ہی کاٹ لیا

سائیکل کی آنکھوں میں آنسو

ایک دن سائیکل کے چکر میں
گھر کی دہلیز سے گرا تھا میں
شور گھر میں گُھسا تو پورا گھر
ایک لمحے میں آگیا باہر
سائیکل کے تلے دبا تھا میں
دھیان سب کا تھا سائیکل کی طرف
سائیکل مجھ سے زیادہ زخمی تھی
اُس کی آنکھوں میں آنسو زیادہ تھے

سائیکل کی آنکھوں میں آنسو

ایک دن سائیکل کے چکر میں
گھر کی دہلیز سے گرا تھا میں
شور گھر میں گھسا تو پورا گھر
ایک لمحے میں آگیا باہر
سائیکل کے تلے دبا تھا میں
دھیان سب کا تھا سائیکل کی طرف
سائیکل مجھ سے زیادہ زخمی تھی
اُس کی آنکھوں میں آنسو زیادہ تھے

سائیکل کی آنکھوں میں آنسو

ایک دن سائیکل کے چکر میں
گھر کی دہلیز سے گرا تھا میں
شور گھر میں گھسا تو پورا گھر
ایک لمحے میں آگیا باہر
سائیکل کے تلے دبا تھا میں
دھیان سب کا تھا سائیکل کی طرف
سائیکل مجھ سے زیادہ زخمی تھی
اُس کی آنکھوں میں آنسو زیادہ تھے

نانی

تختی

بستہ
کھیل تماشے

بندر

بھالو
ہاتھی

گھوڑے
ساری دنیا جھوٹی تھی
بس اک نانی ہی سچی تھی
مرے لئے سب سے لڑتی تھی

اُڑنے والے سانپوں کا جوڑا

گاؤں کے نکڑ پر اک گھر ہے
دو املی کے پیڑ کھڑے ہیں
پاس ہی اک تالاب ہے جس میں
پیڑوں کے سائے ڈوبے ہیں
املی کی اک موٹی شاخ پہ
اُڑنے والے دو سانپوں کا
خطرناک جوڑا رہتا ہے
رات میں دونوں اُڑ جاتے ہیں
جانے کس کے گھر جاتے ہیں

سنگاپور

سات سمندر پار گئے ہیں نانا جان
دیوؤں پریوں کا اک دیس ہے سنگاپور
سنگاپور سے جب آئیں گے
شیشے کی گولی لائیں گے
نئے نئے کپڑے لائیں گے
گیند بھی اک خربوزے والی
جس میں
لال
ہرے
پیلے
سب رنگ رہیں گے
لیکن جب یہ سوچتا ہوں تو ڈر لگتا ہے
دیو کہیں نانا سے میری
ساری چیزیں چھین نہ لیں
چھینیں گے تو حافظ جی سے کہہ دوں گا
حافظ جی سے سب ڈرتے ہیں

مَٹ کھنّا[1]

تختی پر ڈھی[2] کا لیپ بھلا لگتا ہے
تختی اُجلی ہو جاتی ہے
لیکن جب لکھو تو سیاہی پھیلتی ہے
کالی اور پیلی مٹی پر سیاہی تو رُک کر چلتی ہے
لیکن حرف نہیں بنتے ہیں
بن بھی جائیں تو گندے سے لگتے ہیں
بازو والا مٹی کا گھر گر جائے تو کام بنے
مٹ کھنے کا لیپ لگاؤں
پھر تختی کو دھوپ دکھاؤں
جب سوکھے تو اک کھینچن[3] سے
سیدھی سی کچھ لائن کھینچوں
لائن پر الفاظ سجاؤں
نیچے اپنا نام لکھوں
مکتب جائے یا گھر آئے
پورا دن تختی مسکائے

۱۔ ایک خاص مٹی، جو مٹی کے پرانے گھروں کی دیواروں سے نکلتی تھی۔

۲۔ Chalk، کھریا۔

۳۔ ریڈیو یا ٹارچ میں استعمال شدہ بیٹری کو توڑ کر نکالی گئی کالی پنسل۔

نظر کا تعویذ

ماموں کا اک ہرواہا [1] ہے
ہرواہے کی اک بیوی ہے
کالی بھدی بدصورت سی
جو اکثر ہرواہی [2] لینے
سر پر نیم کا تیل دبائے
شام کو میرے گھر آتی ہے
دروازے سے لگ جاتی ہے
آج وہ دن ہی میں آئی تھی
ہم سب کھانے پر بیٹھے تھے
رات میں مجھ کو بھوک نہیں تھی
لیکن نانی دودھ کٹورہ
لے آئیں اور پیار سے بولیں
جو بچے اچھے ہوتے ہیں
خالی پیٹ نہیں سوتے ہیں
بھالو والا کل آئے گا
اک تعویذ بنا جائے گا
اور چمائن [3] مر جائے گی

۱۔ ہل چلانے والا مزدور۔ ۲۔ ہل چلانے کی مزدوری۔ ۳۔ چمارن، چمار کی تانیث۔

سانپوں کے پھن

سرپت کی جھاڑی کے پیچھے
جوڑا کھاتے دو سانپوں نے
دیکھ لیا تھا مجھ کو اک دن
اس دن سے میرے خوابوں میں
سانپوں کے پھن لہرائے ہیں
خوف کے سائے گہرائے ہیں

کالی ماں کا مندر

چمروٹی[1] کے رستے میں
کالی ماں کا مندر ہے
شام ڈھلے تو ایک چڑیل
مندر کے پچھواڑے سے
رستے میں آجاتی ہے
بچوں کو کھا جاتی ہے

۱۔ چماروں کی بستی

ڈاکہ

کالے کالے ڈاکو چھت پر
دھم دھم کرتے دوڑ رہے ہیں
کمروں سے سب بکس اُٹھا کر
چھت پر لا کر
بے رحمی سے توڑ رہے ہیں
ان بکسوں میں ایک بڑا سا بکسا میری امّی کا ہے
جس میں میری شیشے والی گولی کی تھیلی رکھی ہے
اس بکسے کے سامانوں کو
ڈاکو جب بکھراتے ہیں تو
بڑا مزہ آتا ہے مجھ کو
دوڑ کے میں چھت پر جاتا ہوں
بندوقوں کے سناٹے میں
اپنی سب گولی چنتا ہوں
صبح کو میرے سارے ساتھی
میری رنگ بھری گولی کو
للچائی نظروں سے تکتے رہتے ہیں
بربادی کا ماتم مجھ کو گولی کے رنگوں سے ہلکا لگتا ہے

شیطانوں کے جمگھٹ

تیز ہوا!

پیڑوں سے لڑ کر

کچے آم گراتی تھی

آم جو سب سے پہلے چُن لے

اُس کا ہی کب ہوتا تھا

چھینا جھپٹی ہوتی تھی

ہاتھ بدلتے رہتے تھے

پتنگ کسی کی اچھی ہو تو

پھاڑ دیا کرتا تھا کوئی

کسی کا لے کے نیا کھلونا

توڑ دیا کرتا تھا کوئی

بچپن ایسی ریس تھا جس میں

ہار نہ تھی منظور کسی کو

ہارنے والا جیتنے والے کو زخمی کر دیتا تھا

جھیل کے پیچھے

پیڑ کے نیچے

آتے جاتے رستے میں

اسکولوں کے بستے میں

شیطانوں کے جمگھٹ تھے

یہ شیطان کبھی بچوں کو

آپس میں لڑواتے تھے

پھر خود ہی ملواتے تھے

بچے تو مل جاتے تھے

بڑوں میں لاٹھی چلتی تھی

میلہ

ندی کنارے لگا تھا میلہ
وہیں پہ تھا اک بڑا سا مندر
مندر سے تھوڑی دوری پر
لمبا چوڑا اک پتلا تھا
اس پتلے میں آگ لگی تھی
آگ سے اک ہاتھی بدکا تھا
اور بدک کر چنگھاڑا تھا
کئی دکانوں کو الٹا تھا
کئی گاڑیوں کو پلٹا تھا
سبھی کھلونے توڑ دیئے تھے
بنسی بیچنے والا بوڑھا
لاٹھی چھوڑ کے بھاگ رہا تھا
ہاتھی کے اس پاگل پن سے
افراتفری مچی ہوئی تھی
تتر بتر سارا مجمع تھا
ادھر اُدھر سب کچھ بکھرا تھا
مٹی والے کھلونے والے
ہری چھال کے کیلے والے
گھگھنی اور پکوڑی والے

برفی اور جلیبی والے
گنّا اور بتاشے والے
سارے کھیل تماشے والے
سب ہاتھی سے ڈرے ہوئے تھے
سب نے اُس کو خوب کھلایا
تب ہاتھی قابو میں آیا
میلہ دیکھ کے شام ڈھلے جب
لوٹ کے میں گھر پر آیا تو
مجھے وہ پُتلا پھر یاد آیا
جو مندر کے پاس جلا تھا
میں نے اس کے بارے میں جب
اپنی نانی سے پوچھا تو
نام بتا کر اس پُتلے کا
ڈرا دیا مجھ کو نانی نے
کہا کہ اس کا نام نہ لینا
راون اک ظالم راجہ تھا
سیتا کو جو لے بھاگا تھا
وہ تم کو بھی لے بھاگے گا
مجھ کو اس پر غصہ آیا
غصے میں پھر میں نے سوچا
اگلے برس جب لگے گا میلہ
تو راون کو میں پھونکوں گا

خون مگر بہتا رہتا ہے

سائیکل پر پیچھے بیٹھا
چھوٹے ماموں کے ہمراہ
قوالی سننے جاتا ہوں
اپنے گاؤں سے باہر جا کر
شہزادوں کی رات بتانا
میرے لئے اک افسانہ ہے
قوالی سننا تو ایک بہانہ ہے

کھلی سڑک سے بازاروں تک خواب نگر ہے
پابندی سے آزادی کا ایک سفر ہے
اور سفر میں
پیچھے مڑ کر
ماموں یہ کہتے رہتے ہیں
تیلی میں نہ جائے پاؤں
پاؤں ذرا پھیلا کر بیٹھو
لیکن ننھے ننھے پاؤں
اس ترچھے اور تیڑھے پن سے
آخر کو تھک جاتے ہیں
تیلی میں پھنس جاتے ہیں
سائیکل رک جاتی ہے
خون مگر بہتا رہتا ہے

مداری

کندھے پر تھیلا لٹکائے
ہاتھ میں ڈمرو بنسی لے کر
گاؤں کے چوراہے پر جاؤں
بھیڑ لگاؤں
بھیڑ اکٹھا ہو جائے تو تھیلے سے
ڈبے
ہڈی
تاش کی گڈی
کنکر پتھر
خونی خنجر
اور کئی سامان نکالوں
لوگوں کی نظروں کو باندھوں

چٹکی بھر کر دھول اٹھاؤں

منتر ماروں

منتر مار کے

رسّی یا ٹائر پر پھینکوں

سانپ بناؤں

بچوں سے تالی بجواؤں

گاؤں کے سارے بچے میرے گن گائیں

چھوٹے چھوٹے ہاتھ مرے لب ہو جائیں

ٹارچ سورج نہیں ہے پھر بھی

آخر کو بارش کی بھی اک حد ہوتی ہے
ایسی بارش کس کے بھلے کی
جو بس برسے
پیڑ گرائے
گھر اُلٹے

سوچ رہا ہوں
گرتے پیڑوں
اور گھروں کے کام آؤں
گھروں کو اپنے سوکھے کپڑے پہنا دوں
پیڑوں کے ہاتھوں میں چھتری پکڑا دوں

لیکن ایسی بارش میں
پیڑ پہ چڑھنا ٹھیک نہیں
شاخیں ساری بھیگ چکی ہیں
گر جانے کا خطرہ ہے
دوسرے یہ کہ
اتنی چھتری اور کپڑے بھی پاس نہیں
اچھا تو پھر یوں کرتا ہوں
لالٹین لے کر آتا ہوں
لیکن وہ تو خود روتی ہے
باہر نکلی تو اک دم سے بجھ جائے گی
ٹارچ کہیں سے مل جائے تو کام بنے
ٹارچ کو دیکھے گی تو بارش ڈر جائے گی

کچے رنگوں کا موسم

گھر سے بستہ اور ٹفن کے ساتھ نکلنا مکتب کو
آدھے ہی رستے سے گھوم کے واپس آنا
شام ڈھلے تک کھیلنا کودنا
آپس میں جھگڑے کرنا
پھر مل جانا
باغ سے جا کر آم چرانا
پکڑے جانا
گھر پر آ کر ڈانٹیں سننا
کبھی کبھی تھپڑ بھی کھانا

کچے رنگوں کا موسم

گھر سے بستہ اور ٹفن کے ساتھ نکلنا مکتب کو
آدھے ہی رستے سے گھوم کے واپس آنا
شام ڈھلے تک کھیلنا کودنا
آپس میں جھگڑے کرنا
پھر مل جانا
باغ سے جا کر آم چرانا
پکڑے جانا
گھر پر آ کر ڈانٹیں سننا
کبھی کبھی تھپڑ بھی کھانا

گنّے سے مرجھائے اور کالے پھولوں سے
نقلی داڑھی مونچھ بنانا
چھپ کر جوٹھی بیڑی پینا
کھیتوں میں جھاڑے کو جانا
ادھر ادھر کی باتیں کرنا
اک گورے لڑکے کے پیچھے تکتے رہنا
کم عمری میں بالغ ہونا
الٹے سیدھے دھیان میں شب بھر جاگتے رہنا
کتنا اچھا لگتا تھا
وہ راتیں کتنی پیاری تھیں
وہ دن کتنے البیلے تھے

دیوار میں در

روز پڑھائی، روز لکھائی
تختی، بستہ، مولوی، مکتب
اُوب چکا ہوں ان چیزوں سے
گھر والے بھی سب پاگل ہیں
نہیں پڑھتو تو مارتے ہیں
وہ لڑکے جو چرواہے ہیں
ان کی چاندی ہی چاندی ہے
پیڑ پہ چڑھ کر لکھن[1] کھیلتے
کھیت میں گنّے چوستے ہیں
آم اور جامن چنتے ہیں
دن بھر گھومتے پھرتے ہیں
بھینس کی پیٹھ پہ جھولا جھولتے
مزے سے شام کو گھر آتے ہیں
سوچ رہا ہوں میں بھی اک دن
اپنی بھینس کو کھونٹے سے کھولوں
جنگل میں غائب ہوجاؤں

۱۔ انشمہ گڑھ کے دیہاتوں کا ایک کھیل۔

بمبئی

بمبئی بھاگ کے جانے والے
لڑکے جب واپس آتے تھے
ان کی باتیں سنتے کان نہیں تھکتے تھے
جاگتی آنکھیں خوابوں میں کھو جاتی تھیں
ذہن میں اک ان دیکھی اور انجانی بمبئی
دن بھر اپنی لمبی چوڑی سڑکوں پر
کاروں اور بسوں میں گھومتی پھرتی تھی
رات کو تارے اوڑھ کے جگمگ کرتی تھی

بہت بارش ہوئی تھی

بہت بارش ہوئی تھی
جدھر دیکھو ادھر جل تھل ہی جل تھل تھا
بدن بیلوں کے مٹی میں سنے تھے
سبھی ہل میں نندھے تھے
جو جوتے جا چکے تھے کھیت
ان میں دھان روپا جا رہا تھا
فضائیں
بارشوں کی چھم چھما چھم
اور مزدوروں کے گیتوں سے
سریلی اور نشیلی ہو گئی تھیں

میں اپنے گھر سے باہر
صحن میں
جہاں برسات کا پانی رُکا تھا
وہیں پر ایک کشتی کو
بنا کر بس
بہت خوش ہو رہا تھا
پھر اُس کے بعد
میں نے پاس کے اک کھیت سے
کچھ دھان کے پودے اُکھاڑے تھے
پھر اُن کو میں نے اپنی چھوٹی سی کیاری میں رو پا تھا
ہوا چلتی تھی تو پودے
ہوا کے ساتھ مل کر سرسراتے تھے
کوئی نغمہ سناتے تھے
میں اُن کے نغموں کی لہروں میں بہنا چاہتا تھا
اُنھی کے ساتھ رہنا چاہتا تھا
مگر اُس کھیت کے مالک نے آ کر
مجھے تھپڑ لگایا
گالیاں دیں
مری معصومیت کے رنگ سارے اُڑ گئے تھے
ابھی کچھ دیر پہلے تک
جو پودے گا رہے تھے
وہ اب مرجھا رہے تھے

میں بھی کھاد کا حصہ ہوں

گرمی کا موسم ہے

باہر سویا ہوں

سورج کی ہلکی سی لالی

آ کر مجھے جگاتی ہے

بستر چھوڑ کے کھیت کی جانب جاتا ہوں

جھاڑے سے فارغ ہو کر واپس آتا ہوں

بیلوں اور بھینسوں کو چارہ دیتا ہوں

کھا چکتے ہیں جب تو کھول کے ناندوں سے

امی کے سائے کے نیچے لاتا ہوں

ان کے گندے پن سے نفرت کرتا ہوں

لیکن پھر اگلے ہی لمحے

دونوں ہاتھ سے ناک دبائے

بڑو ورنی[1] میں ٹھس جاتا ہوں

ہاتھ پاؤں میں گوبر ہی گوبر ہوتا ہے

کھانچی کو گوبر سے بھر کر

تنہا ہی رکھتا ہوں سر پر

گھورے[2] تک لے آتا ہوں

رستے بھر اکلاتا ہوں

آخری کھیوے کے ہمراہ

میں بھی گھور میں گر جاتا ہوں

گوبر میں مل جاتا ہوں

میں بھی کھاد کا حصہ ہوں

۱۔ وہ جگہ جس میں گائے بیل اور بھینس وغیرہ رہتے ہیں۔

۲۔ وہ جگہ جس میں کھاد کے لیے گوبر اکٹھا کیا جاتا ہے۔

مٹی میں جب دُکھ ملتا ہے

ساڑھے پانچ کلاسیں پڑھ کر
شاعر ہونا
اور منوانا
سب کے بس کی بات نہیں
بیلوں اور بھینسوں میں رہ کر
لفظوں کو چمکاتے رہنا مشکل ہے
لیکن میں نے یہ جانا ہے
مٹی میں جب دُکھ ملتا ہے
تو کوئی الہام ہوتا ہے
فن پارے تخلیق ہوتے ہیں
آوازوں کو چہرے
چہروں کو آوازیں ملتی ہیں
لفظوں میں تصویریں چلتی ہیں

ماں جیسی خالائیں

خالائیں
ویسے بھی ماں سی ہوتی ہیں
لیکن میری خالائیں
کچھ زیادہ ہی ماں جیسی تھیں
تینوں میں سے اک نے تو
میری ماں کے مرنے پر
میرے چھوٹے بھائی کو
اپنا دودھ پلایا تھا
میرا بھائی اُس خالہ کا
کتنا اچھا بیٹا ہے
یہ مجھ کو معلوم نہیں

احساس ہی دُکھ ہے

میرے دُکھ بھی
سب کے دُکھ جیسے ہی تھے
میں نے خود ہی جی سے اُن کو ختم کیا
میں نے جس ماحول میں خود کو
رو کر ضائع کر ڈالا
میرا بھائی اُسی فضا میں
بڑا ہوا برگد کی طرح
میں نے جتنا چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کیا
بڑی بڑی باتوں سے بھی
وہ اتنا ناواقف تھا
جن رشتوں کی نزدیکی میں
میں نے اک دوری دیکھی
اُن رشتوں کی دوری سے
اُس کا نزدیکی رشتہ ہے
اپنے ماموں کا میں بھی کچھ لگتا ہوں
لیکن وہ ماموں کے بیٹے جیسا ہے

غلیل سے کام نہیں بنے گا

گوریا جتنی سیدھی ہے
اتنا ہی چالو کوا ہے
لاکھ چھپاؤں غلیل میں اپنا
سالا دیکھ ہی لیتا ہے
کوا جب تک اُڑ نہ جائے
طوطا، مینا، بگلا، ہدہد
کوئل، بلبل اور کبوتر
بے فکری سے رہتے ہیں
چرخی، فاختہ اور کلہنی
کوے کی ہشیاری سے ہی
خود کو چوکنا رکھتی ہیں
کرتے ہیں بھرپور بھروسہ

یہ بیتی کالے کوّے پر
سوچ رہا ہوں ایسا کچھ ہو
کوّے سے یاری ہو جائے
کوّا اپنے ہاتھ میں ہوگا
تو ہر چڑیا اپنی ہوگی
چڑیوں کو پنجرے کے اندر
کوّے کو باہر رکھوں گا

تماشہ

کوّا بڑا سیانا ہے
پتھر ہاتھ میں آتے ہی
اِدھر اُدھر اُڑ جاتا ہے
لیکن بارش کے موسم میں
بجلی کے تاروں میں پھنس کر
کبھی کبھی مر جاتا ہے
اس کی موت پہ سارے کوّے
مل کر شور مچاتے ہیں

ناظم نائی کا چُھرا

وہ چُھرا، جس سے مُنتی ہے داڑھی
اور جو بال کاٹا کرتا ہے
گُلی ڈنڈا بنانے کی خاطر
آج میں نے اُسے چُرایا ہے
دے کے کتنی تلاشیاں اپنی
مشکلوں سے چھپا کے لایا ہوں

وہ جو امرود ہے احاطے میں
اس پہ اک ڈال میں نے دیکھی ہے
سیدھی لمبی بغیر گُچھے کی
صبح اُٹھ کر اسی کو کاٹوں گا

رات بستر پہ دیر تک سوچا
اور پھر نیند آگئی مجھ کو
نیند آئی تو خواب بھی آیا
خواب میں دیکھا میں نے ناظم کو
وہ چُھرا پھر سے اس کے ہاتھ میں ہے
اور گردن کٹی ہوئی ہے مری

طاقچے پر رکھا ہوا خدا

کتاب پروردگار!
میں نے
پڑھی تھی مکتب میں اس لیے کہ
مدرسوں کی نظر کا خوف و ہراس مجھ میں اُتر گیا تھا
مگر جو نکلا ہوں میں وہاں سے
تو ہاتھ پہنچے نہ طاقچے تک
جہاں اُجالا
سیاہ کپڑے میں
میرے ہاتھوں کا منتظر ہے

کھیلوں کی دنیا

شوق بہت تھا مجھ کو کھیل تماشے کا
کھیل کے لیکن ساز و ساماں میرے پاس نہ تھے
وہ چیزیں، جن میں بستا تھا دل میرا
سب بازاروں میں پیسوں سے ملتی تھیں
پیسے ماموں کی جیبوں میں رہتے تھے
فرق ہے جتنا ابا میں اور ماموں میں
اتنی ہی دوری تھی مجھ سے پیسوں کی
شوق نے لیکن ہنر مجھے سکھلایا تھا
میں نے لکڑی کاٹ کے بیٹ بنایا تھا
کپڑوں کی کترن سے گیند بنائی تھی
لئی سے چپکا کے پتنگ اڑائی تھی
ٹیوب کاٹ کر کئی غلیل سجائے تھے
دفتی کے ٹکڑوں سے تاش بنائے تھے
قبر سے آ کر اماں مجھے کھلاتی تھی
میں کھیلوں کی دنیا کا شہزادہ تھا

پیسہ بڑا مہنگا تھا

فیٖد دس روپے کی ہوتی تھی
میلہ دو چار میں نپٹتا[1] تھا
پھلجھڑی میں نکلتی تھی سُبرات[2]
اور محرم تو یونہی جاتا تھا
پانچ پیسے کی تین ٹافی تھی
ذائقہ جس میں سنترے کا تھا
گولیاں دس کی بیس ملتی تھیں
تیس چالیس کی پتنگیں تھیں
آٹھ آنے میں گیند ملتی تھی
بارہ آنے میں لٹو ملتا تھا
سبزیوں سے بھرے ہوئے تھے کھیت
پھل درختوں سے مفت ملتے تھے
میری دنیا میں چیزیں سستی تھیں
پیسہ لیکن بڑا ہی مہنگا تھا

۱۔ نمٹتا۔ ۲۔ شب براءت۔

مینڈک کی آواز

بارش کے سوکھے موسم میں
پورا گاؤں دُعا کرتا تھا بارش کی
تب پوکھر کے ساحل پر
منھ کھلتے تھے مینڈک کے
مینڈک کی آواز اشارہ ہوتی تھی برساتوں کا
رات کے گہرے سناٹے میں
سوئی آنکھیں کھل جائیں تو
مشکل سے پھر لگتی تھیں
دیواروں پر بھوتوں اور چڑیلوں کی شکلیں بنتی تھیں
خوف کے اس عالم میں اکثر
مینڈک کی آواز بدل جاتی تھی ماں کی لوری میں
خواب پرو دیتی تھی نیند کی ڈوری میں

عید

اُجلا کرتا اور پاجامہ
سر کے اوپر اُجلی ٹوپی
عید بڑی اُجلی ہوتی تھی
صبح کے نور سے روشن ہو کر
بڑوں کے ساتھ دوگانہ[1] پڑھ کر
اپنے یاروں سے ملتی تھی
تھام کے پھر کھیلوں کی انگلی
شام تلک چلتی رہتی تھی
رستے رستے دھول اُڑا کر
کپڑوں میں سو داغ لگا کر
کالی پیلی ہو جاتی تھی
سر کی ٹوپی جیب میں آ کر
جیب سے گر کر کھو جاتی تھی
کھیل دھرے تھے سر کے اندر
سر ٹوپی میں دھرا کہاں تھا
ٹوپی میں تہذیب تھی لیکن
کھیل کا اس میں مزا کہاں تھا

۱۔ عید کی نماز

کُتیا کے بچے

پوس ماگھ کے جاڑے میں
چھوٹے سے اک باڑے میں
اک کتیا نے رنگ برنگے کچھ بچوں کو جنم دیا

ان بچوں کے چہروں پر
کچھ لوگوں نے اُنگلی سے

اپنا اپنا نام لکھا

موسم بدلا

سردی میں برسات ہوئی

آگ

ہوا

مٹی

پانی

سب برف ہوئے

اس دن وہ سارے بچے بھی جیسے برف کے ٹکڑے تھے
لیکن ان پر نام نہیں لکھا تھا کوئی
ہاتھ چھپا رکھے تھے سب نے دستانوں میں
کتیا روئی چلائی میدانوں میں

نیند

پاؤں دبا کر آتی ہے
لالٹین دھیمی کر کے
آنکھوں میں چھپ جاتی ہے
ڈھونڈو تو کھو جاتی ہے
پکڑو تو اُڑ جاتی ہے

سردی

مفلر باندھے
سوئٹر پہنے
دن بھر باہر کھیلتی ہے
شام ذرا سی ہوتے ہی
کمبل میں گھس جاتی ہے
صبح کو جلدی اُٹھتی ہے
آستین میں ناک پونچھتی
تھر تھر تھر تھر کانپتی ہے
ہر دم کچھ اوڑھے رہتی ہے
بے چاری کو جانے کیا بیماری ہے

گرمی

شام کو باغ سے گھر آتی ہے
بستر پر لیٹے لیٹے
ہاتھوں سے پنکھا جھلتی ہے
مچھر سے لڑتے لڑتے تھک جاتی ہے
ایسے میں جو نیند آئے تو
دن نکلے تک سوتی ہے
سویرا اٹھتی ہے تو تھوڑا ٹہلتی ہے
پھر تالاب میں گر جاتی ہے

بارش

چوکھٹ پر پہرہ رہتا ہے
اندر بیٹھی روتی ہے
دروازہ جب کھلتا ہے تو چپکے سے
گولی لقو لے کے باہر جاتی ہے
کیچڑ پانی میں پھرتی ہے
بھیگی بھاگی گھر آتی ہے
گھر آ کر تھپڑ کھاتی ہے

آندھی

رات میں زور کی آندھی آئے
باغ میں جا کر پیڑ گرائے
ایک آم کا
اک جامن کا
صبح سویرے آنکھ کھلے تو
میں بھی سیدھا باغ میں جاؤں
آم اور جامن گھر لے آؤں

دن

تختی اور بستے کے ساتھ
دن بھر مکتب میں رہتا ہے
بیٹھا بیٹھا بور ہوتا ہے

رات

دیووں پریوں سے ملتی ہے
مل کر اتنا خوش ہوتی ہے
نیند میں بھی ہنستی رہتی ہے

رنڈی کا ناچ

سروں پر
چمچماتی پگڑیوں
تنی مونچھوں
کھڑکتی لاٹھیوں کے بیچ
رنڈی ناچتی تھی جب
تو مت پوچھو
عجب ماحول ہوتا تھا
اِدھر اک غول ہوتا تھا
اُدھر اک غول ہوتا تھا
چتریا رقص کرتے وقت
کسی کی گود میں آ کر
ذرا جو بیٹھ جاتی تھی
تو جیسے آگ لگ جاتی تھی مجمع میں
چمک اٹھتی تھیں تلواریں
گرج اٹھتی تھیں بندوقیں
ہوا میں کارتوسوں کی مہک گھل جایا کرتی تھی
ہمارے گاؤں میں پہلے بلا کے مرد ہوتے تھے

نوٹنکی

اُدھر پنڈت نے تاریخیں بتائیں
ادھر رُت آ گئی جیسے لگن کی
جدھر دیکھو ادھر شادی ہی شادی
اُجالا
ناچ
نوٹنکی
نگاڑہ
مجھے ساڑی پہن کر
ناچتے لونڈوں میں دلچسپی نہیں تھی
نہ آڑے ٹیڑھے جوکر ہی
کبھی اچھے لگے مجھ کو

ڈرامہ کھیلتے تھے جب

کوئی راجہ

کوئی رانی

کوئی سیناپتی بنتا

کبھی بچھڑے ہوئے دو بھائیوں میں

ایک ڈاکو

ایک تھانیدار ہوتا تھا

کوئی کردار

ایسی ماں کا

جس میں

میں بھی

اپنی ماں کی صورت دیکھ لیتا تھا

وہ ناٹک یاد آتے ہیں

تو سب کردار

مجھ میں پھر سے چلنے لگتے ہیں

اندھیری رات میں

بارات میں

سروں پر لائٹوں سے گیس جلنے لگتے ہیں

کبڈی

اک خانے میں موت ہے میری
اک خانے میں میں تنہا ہوں
بیچ میں اک جیون ریکھا ہے
جینے مرنے کا لیکھا ہے
مجھ کو اپنے اس خانے سے
اُس خانے تک اب جانا ہے
موت کے منھ سے سانس بچا کر
جیون ریکھا تک آنا ہے
کھیل سے باہر ہونے والے
میرے سارے مُردہ ساتھی
پھٹی پھٹی زندہ آنکھوں سے
میری جانب دیکھ رہے ہیں

دہلا پکڑ

دو سے دُکڑی
تین سے تکڑی
چھ سے چھکڑی ہوتا تھا
تاش کے کھیلوں کے یہ نام بھی
کھیلنے والوں کی تعداد پہ رکھے تھے
لیکن وہ جو دہلا پکڑ تھا
اس کا مزہ کچھ اور ہی تھا
کھیلنے بیٹھو تو ہر کام بگڑ جاتا تھا
نہ بھینسیں چرنے جاتی تھیں
نہ بیلوں کی گھاس آتی تھی
نہ بازار کوئی جاتا تھا
اپنی بھوک اور پیاس کا بھی احساس نہیں ہوتا تھا ہم کو

بڑوں کی گالی اور ڈانٹوں سے
ہم اڑ کے بے پروا ہو کر
شام تلک کھیلا کرتے تھے

پورا دن بس بیکاری میں کٹ جاتا تھا
اس لیے تو گاؤں کے بوڑھے
یہ کہہ کر سمجھاتے تھے
جس گھر میں ہوتا ہے تاش
وہ گھر اک دن گر جاتا ہے

۱۔ منڈی کوٹ

والی بال

اُس جانب سے سروس ہو کر
اس جانب جو بال آتی تھی
اکثر میرے ہاتھوں سے ٹکراتی تھی
عمر میں میں چھوٹا پلیئر تھا
لیکن اپنی ٹیم کا میں سب سے مضبوط ڈفنسر تھا
میری کھیلی بال کو افضروالرکو فنگر کرتا تھا
لمبا والر مجح آؤٹ سے سروس چیلنج کراتا تھا
پھر ہم اپنے پوائنٹس کی رفتار بڑھایا کرتے تھے
کبھی کبھی یہ میچ تو اتنے کانٹے کا ہو جاتا تھا
دیر تلک دونوں ٹیموں کے کھاتے رک جایا کرتے تھے
میچ کی اس گرمی کا کارن پارلے جی بسکٹ کی بازی ہوتا تھا
یہ بازی اک سنگاپوری دادا رکھا کرتے تھے

بازی کا انجام سدا مغرب کی اذاں پہ ہوتا تھا
جیتنے والے دادا کے سنگ
بسکٹ کھاتے
نخرے کرتے
ہارنے والے ان کے پیچ میں
بدلے کے جذبات سے ہو جاتے تھے
ایسی ہی اک شام تھی وہ بھی
جس میں دادا ہار گئے تھے
موت نے بسکٹ کھایا تھا
پتا چلا نہ موت اور ان کے بیچ یہ کھیل پرانا تھا
ہم لڑکوں کی ہار جیت میں اُن کا بھی افسانہ تھا

اب نہ دعویٰ نہ اعلان ہے
نہ بازی ہے نہ گھمسان ہے
نہ مغرب کی ویسی اذان ہے
گناہوں سے اٹا ہوا میدان ہے
جانے کیسی ہار ہوئی ہے
جانے کیسا یہ کھانا ہے
پورے گاؤں میں سناٹا ہے

سیدھا سلطان پور

یہ ددھیالی گاؤں ہے میرا
لیکن نہ اس میں دادی ہے
نہ اس میں میرے دادا ہیں
گھر میں اک سوتیلی ماں ہے
اور ابا میں بیگانے سے
اک پھوپھی ہے جس کے من میں
پیار بہت ہے میری خاطر
لیکن اس کی الگ ہے دنیا
وہ اپنی سسرال میں گم ہے
سنا ہے کہ اک اور ہے پھوپھی
ابھی مجھے اس سے ملنا ہے
میں جب اپنے گھر آتا ہوں
بالکل تنہا ہو جاتا ہوں

نہ تو میرے کھیل یہاں ہیں
نہ میرے یاروں کی ٹولی
اسی لیے اس گاؤں میں جم کر
کبھی نہیں رہ پاتا ہوں میں
بس آتا اور جاتا ہوں میں
شاید یونہی آتے جاتے
اک دن دوری طے ہو جائے
یہ جو دل میں بے چینی ہے
اس کو چین کہیں مل جائے

سہریا

یہ ننھیالی گاؤں ہے میرا
یہیں پہ میرا جنم ہوا تھا
یہیں پلا میں یہیں بڑھا میں
یہیں پہ کھیلا یہیں پڑھا میں
یہیں پہ میں نے بھینس چرائی
یہیں پہ میں نے چارے بانے
یہیں پہ میں نے کدال چلائی
یہیں پہ میں نے گوبر کاڑھے
یہیں پہ تھے میرے ہمجولی
یعنی ایک بھنوروا ٹولی
اک ناصر تھے اک طاہر تھے
اک جیسے دو جڑواں بھائی
گولی کے چکر میں ان سے
ہوتی تھی ہر روز لڑائی
اک ہٹلر تھے سیدھے سادے
بھائی تھے وہ ماموں زادے
جو چاہیں وہ مل جاتا تھا
ہٹلر تھے گھر کے شہزادے
ننھو بڑے تھے، منو چھوٹے

اک ننھو تھے اک منو تھے
منو کھیل میں جب روتے تھے
تو ننھو بدلہ لیتے تھے
پھوڑے والا ایک سہیل تھا
دانت کاٹتا اک محفوظ تھا
اک شنکر تھا چوری کرتا
لڈن اور متین سے پٹتا
مجو اپنے آم کے نیچے
بیٹھ کے رکھوالی کرتا تھا
اور کوثر اپنے ابا سے
بھاگا بھاگا سا رہتا تھا
ایک وسیم تھا جس کا بیٹھک
بچوں کا اڈہ بنا ہوا تھا
صادق بتو تاش کے ماہر
انو اور سعید پڑھتے تھے
غفورو کچا چاول کھاتا
اور بس بھنگ بیڑی پیتا تھا
اک ہارون تھے اک فضل تھے
انہیں بھی بیڑی کا چسکا تھا
سب لڑکوں کو بیڑی پینا
غفورو ہی نے سکھلایا تھا
بیچارہ دبلا اک نوشاد تھا

والی بال میں تھا وہ چیمپئن
کرکٹ میں بھی وہ کپتان تھا
اِن کو اُن سے اُن کو اِن سے
آپس میں لڑوا دیتا تھا
لیکن ننھو اور علی شیر سے
وہ تھوڑا تھوڑا ڈرتا تھا
اک فیضان جو میرا یار تھا
ہم دونوں میں سچا پیار تھا
گاؤں کے اس افسانے میں وہ
سیدھا سادہ اک کردار تھا
اک انصار تھا ساتھ میں جس کے
اک دن میں تھمبی بجاتا تھا

اک بُلیا اک چھروی والی
ایک کھمبیرے اک بلواری
ایک تجنوا اک گھراتہ
ایک کھنسیواں اک پیراتہ
اک امرا تھا اک بتولی تھی
ایک گدام اور اک گھمتی تھی
دو چھروٹی اک گنیانہ
ایک بھنوا اک ڈھبیانہ

اک پچھوں تھا اک اجر تھا
اک ننھو اک کالی تر تھا
الپو ارذوال اور زرینا
اور تھا اک بابا کا اندرا
جامن کے جب دن آتے تھے
ہم کتوالی پہ جاتے تھے
یہ سب تھے سیوان ہمارے
کھیت تھے اور کھلیان ہمارے
کھیل کے تھے میدان ہمارے
ایک ہماری ندی بگھاڑی
جو برسات میں ہی بہتی تھی
لیکن جتنے دن بہتی تھی
ہر گھر میں مچھلی رہتی تھی

گاؤں میں تھے کچھ مرد بھی ایسے
جنھوں نے اپنے آپ کو گم کر
خود کی ایک شناخت بنائی
اک تھے بھوتھا رکشے والے
پاؤں بڑے مضبوط تھے ان کے
سارے گاؤں کا بوجھ اٹھائے
رکشے کی گدی پہ بیٹھے
بس پیڈل مارا کرتے تھے

اک دوبے جو قاضی بن تھے
اپنے گاؤں کی وہ بھی شان تھے
گاڑی ان کی بیلی تھی
بیل بھی ان کے متوالے تھے
اک جو بابا اشتیاق تھے
جینے میں وہ بھی جیالے تھے
یکہ اور گھوڑا رکھتے تھے
موڑ سے آگے چلتے تھے
اک منو تھے یکہ والے
ان کا بھی کڑیل گھوڑا تھا
انھوں نے اک دن شرط لگا کر
ریل کو بھی پیچھے چھوڑا تھا
اک ببو تھے چکی والے
دن بھر رہتے آٹا اوڑھے
شیخن کو اکثر شے کہتے تھے
نقل کرو تو چڑھ جاتے تھے
گوشت کاٹتے اک بھائی تھے
کھری کھری تھیں باتیں ان کی
چبھ جاتے تھے اک کانٹا تھے
اک معروف تھے جو اندھے تھے
ہر دم مسجد میں رہتے تھے
جب بچوں سے وہ پڑھتے تھے

بدھنے سے حملہ کرتے تھے
منشی کا ہوتا تھا بدھنا
ٹوٹ پھوٹ جاتا تھا بدھنا
سلور کی بدھنی ہوتی تھی
بدھنی کی چوری ہوتی تھی
اک منصور جو باورچی تھے
خود بھی اک تیکھی مرچی تھے
غصے میں وہ بریانی کو
کھاسلیٹ سے مہکاتے تھے
وہ فیصل اور رسول سے چڑھتے
لیکن ساتھ انھی کے رہتے
اور انہیں جو کوئی چڑھاتا
ڈنڈا گالی پتھر کھاتا
سبھی سے وہ کشتہ کرتا تھے
یوں سمجھو بھڑ کا چھتا تھے
ان کو جب مرگی آتی تھی
گوبر چپل سے جاتی تھی
ایک شجاعو بھتنا والے
بغل میں اک پستل لٹکائے
بولٹ پہ ایسے چلتے تھے
بالکل داروغہ لگتے تھے
ایک صغیر تھے داڑھی والے

کندھے پہ بندوق جمائے
ساتھ ان کے کتّا رہتا تھا
انھوں نے اک دن خون کیا تھا
بڑوں میں ان کی دھاک جمی تھی
کتّے سے بچے ڈرتے تھے
لال کلر کا تھا وہ کتّا
لیکن اس کا نام تھا کلوا
اک ارشاد تھے ماموں میرے
آدھا گاؤں تھا دشمن ان کا
مگر کبھی وہ رکے نہیں تھے
کسی کے آگے جھکے نہیں تھے
اک صدرو تھے مونچھوں والے
رات کے راجے مہاراجے تھے
بہت بڑے وہ لٹھ باجے تھے
محبوبہ تھی جان تھی لاٹھی
صدرو کی پہچان تھی لاٹھی
لیکن اب نہ مونچھ پہ تاؤ ہے
نہ لاٹھی میں ہاؤ بھاؤ ہے
گاؤں ہمارا آوارہ ہے
کچھ لڑکوں کے کتّوں پہ ہے
بھائی چارہ پیار محبت
سب نفرت کے بھتّوں پہ ہے

میرا بچپن

مٹی کا گھر
گھر میں چولھا
چولھے میں اُپلے کا ایندھن
بھنے ہوئے آلو، گنجی لے کی
مہکی مہکی سوندھی لذت
نئے سال کے باسمتی کا
پکا ہوا تازہ رسیاول [۲]

لوے سے اترتی نرم چپاتی

سونا پگھلا گُڑ کا چھولا[۳]

گھی سے چمکی دال رکابی

سرخی مائل دودھ کٹورہ

چائے کا پیالا

اور پیالے میں

بھنا ہوا مکئی کا لاوا[۴]

بھیلی

چورا

لائی دانا[۵]

امی سا نانی سا کھانا

کہاں گئیں وہ ساری چیزیں

جن میں میرا بچپن تھا

۱۔ Sweet Potato، شکر قند، رتالو۔

۲۔ گنّے کے رس اور چاول سے بنی ایک ڈش۔

۳۔ ادھ پکا تازہ گڑ۔

۴۔ Popcorn۔

۵۔ مُرمرے۔

دوسرا بچپن

پھر سے اسکول جا رہا ہوں میں
لیکن اس بار میرے پیروں میں
کالے جوتے سفید موزے ہیں
اجلی شرٹیں ہیں نیلے نیکر ہیں
بیٹھ پہ میرے بستہ ہے جیسا ہی
ننھا منا سا ایک بستہ ہے
اور بستے میں میرے سپنے ہیں
پھر سے اسکول جا رہا ہوں میں
اپنے بیٹے کی روح میں چھپ کر
میرا بیٹا مرا ہی بچپن ہے

گاؤں کا نیا منظر نامہ

کُھرپی
پھاوڑا
اور درانتی
سب بیکار سی چیزیں ہیں
بیٹھک میں
لوڈو
کیرم
اور تاش کے پتے رہتے ہیں
کمپیوٹر اور ٹی وی پر
گندے چینل چلتے ہیں

تیتروں اور تیتریوں نے جنگل ڈھونڈ لیے
مرغی اپنے انڈوں اور بچوں کے ساتھ
شہری اور بازاری گھر میں رہتی ہیں
پیڑ!
جو میٹھے پھل والے تھے
سوکھ چکے
املی نے بھی پھولنا پھلنا چھوڑ دیا
پانی بھی تالاب میں گم صم رہتا ہے
پتھر مارنے والا کوئی نہیں رہا
بیڑی پینے والے باپوں کے بیٹے
کھلے عام سگرٹ پیتے ہیں
بوڑھوں کی جوٹھی بیڑی کے ٹکڑے
ہم جیسے بچوں کا رستہ تکتے ہیں

مسئلہ

تم شکیل اعظمی!
اب بڑے ہو گئے
تتلیاں چٹکیوں سے پکڑنا
انہیں باندھنا کچے دھاگوں سے اور حسین
گاؤں سے دور ہمراہ پرچھائیں کے
ساحلوں پر گھروندے بنانے کا وہ مشغلہ
اب تمہیں زیب دیتا نہیں
زندگی سانس کی ڈور تھامے ہوئے
کتنی دور آ گئی
اور تم ہو کہ بچوں کے مانند ہی
اب بھی معصوم ہو

سنو میرے الماس بیٹے سنو!

سنو میرے الماس بیٹے سنو!

باپ ہوں میں تمہارا

مجھے اپنا دشمن نہ سمجھو

سچ ہے انگلی پکڑ کر تمہیں میں نے چلنا سکھایا نہیں

لے کے کاندھے پہ تم کو گھمایا نہیں

میں نے تم کو زیادہ کھلایا نہیں

یہ بھی سچ ہے تمھیں پیار کرتا ہوں میں

ہاں بہت پیار کرتا ہوں میں

جن دنوں تم زمیں پر اُتارے گئے

بے مکاں بے وطن بے مددگار اور بے سہارا تھا میں

صرف اک شاعری تھی مری

جس نے ایسے میں مجھ کو سنبھالا بہت

شاعری ہی مرا حوصلہ تھی

میرے جینے کا اک سلسلہ تھی

میں تھا تنہا مگر تم اکیلے نہ تھے

ماں کے مرنے کا غم تم تو جھیلے نہ تھے

اپنی تنہائی کو تم سے آباد کرنے کی چاہت تو تھی

یہ الگ بات حسرت نہ پوری ہوئی

راستے طے کئے کم نہ دوری ہوئی

دور سے بھی مگر میں نے رکھا ہمیشہ تمہارا خیال

سردیوں میں تمہیں اون کرتا رہا

گرمیوں میں تمہیں سوت کرتا رہا

بارشوں میں اوڑھاتا رہا چھتریاں

جب بھی گاؤں آیا لایا کھلونے تمہارے لیے

تم بڑے جب ہوئے

داخلہ جا کے کروایا اسکول میں

ایسے اسکول میں

جس کے کپڑے الگ

جس کے بستے الگ

جوتے موزے الگ

میری اوقات سے تھا زیادہ یہ سب

پھر بھی کرتا رہا

میں تمہارے لیے جیتا مرتا رہا

خیر چھوڑو یہ سب

اب وہ دن کٹ گئے

سب نہیں پھر بھی بادل بہت چھٹ گئے

اب نہ میں بے وطن

اب نہ تم بے مکاں

اب کئی سال سے ساتھ رہتے ہیں ہم
وقت کے ایک دھارے میں بہتے ہیں ہم
اپنے بھائی بہن میں تم اتنے بڑے ہو
کہ کالج میں پڑھنے لگے ہو
اس بڑائی کو سمجھو ذرا
خود کو اندر سے اونچا کرو
جتنی آسانیاں ہیں میسر تمہیں
زندگی اتنی آسان ہرگز نہیں
میری باتیں بری لگ رہی ہیں تمہیں
بولتا ہوں مگر میں بھلے کے لیے
زندگی دور تک بہتے دریا سی ہے
بہتے دریا پہ گھر ناؤ ہے
میرے ہاتھوں میں جس کی یہ پتوار ہے
کیا پتا میرے ہاتھوں سے کب گر پڑے
میرا کیا
آج ہوں
کل رہوں نہ رہوں
پھر یہ کشتی تمہی کو چلانی تو ہے
یہ وراثت تمہی کو نبھانی تو ہے

الماس، میرا پہلا بیٹا۔

سنو کائنات!

سنو کائنات!
اپنے اسکول کی دوستوں میں
نہ دن سارا کاٹو
ذرا ماں کے کاموں کو بانٹو
کہ اب تم بڑی ہو رہی ہو
ذرا ماں سے سیکھو
کہ گھر کیسے بنتا ہے گھر
گھر گرہستی بھی ہے اک ہنر
یہ ہنر زندگی میں تمہارے بہت کام آئے گا
دال چاول کو اک ساتھ کیسے پکائیں کہ کھچڑی بنے
گوندھ کر کیسے آٹے کو روٹی کریں
کیسے مرچی میں لہسن ملائیں تو چٹنی بنے

دوشت مچھلی کا سمجھو سایہ بھی
اپنے ہاتھوں سے تی جلا کر رکھو تم اجالا بھی
گیس چولہے میں جلتی یہ جو آگ ہے
اس میں بھی راگ ہے
راگ یہ بھی ذرا گنگنایا کرو
کچھ بنایا کرو
کچھ پکایا کرو
رکھو باہر کی دنیا سے بھی واسطہ
اپنی طرح چنو اک نیا راستہ
راستے میں ہو منزل کی تصویر بھی
خواب وہ دیکھو جس کی ہو تعبیر بھی

[illegible]

سنو التمش!

سنو التمش!
میں تمھیں سائیکل بھی دلا دوں
چلانا بھی تم کو سکھا دوں
مگر گھر کے باہر جو کالی سڑک ہے
بڑی بے دھڑک ہے
اور تم قیمتی ہو بہت
اپنی ماں کے لیے
اور میرے لیے
ایک کھانسی بھی سوتے میں آئے تمھیں
تو اُچٹ جاتی ہے نیند ہم دونوں کی
جاگ کر صبح کرتے ہیں ہم

جانتا ہوں بہادر ہو تم

اور بیباک ہو

تم ہواؤں کے تیر اک ہو

میرے بیٹے مگر!

اک ذرا اور بڑھ جاؤ تم

سیڑھیاں عمر کی اور چڑھ جاؤ تم

زندگی روز تبدیل کرتی ہوئی بھیس ہے

اک نئی ریس ہے

تم کو پہچاننا ہے اسے ہر نئے بھیس میں

جیتنا ہے تمہیں اس کو ہر ریس میں

آتش، میرا دوسرا بیٹا۔

سنو میری بیٹی صدف!

سنو میری بیٹی صدف!
بات کرتے ہوئے
تم جو خاموش ہو جاتی ہو
خود میں کھو جاتی ہو
گیت بجتا ہے تو
گیت کے ساز پہ
جھوم جاتی ہو تم
اپنے اندر سے باہر تلک
مسکراتی ہو تم
گنگناتی ہو تم
دائرہ نور کا بننے لگتا ہے چاروں طرف
جگمگاتی ہو تم

تتلیاں

پیڑ پودے

پرندے

مہک

پھول

ندیاں

پہاڑ اور رنگوں بھری وادیاں

کھینچتی ہیں تمہیں

تم کو نیچر سے جو اس قدر پیار ہے

تم میں فنکار ہے

ایسا فنکار جس میں خدا سا ہے کچھ

میں نے دیکھا ہے تم میں چھپا سا ہے کچھ

تم اگر اپنے اندر کے فنکار کو

ٹھیک سے جان لو

اُس کو پہچان لو

تو یہ دنیا یقیناً چلے گی اُدھر

تم چلو گی جدھر

صدف، میری دوسری بیٹی۔

سنو شاذیہ!

سنو شاذیہ!

تم مرے ساتھ جب
گھر سے باہر نکلتی ہو تو
میری اُنگلی چھڑا کر
اِدھر سے اُدھر بھاگنے لگتی ہو
اِس گلی
اُس دکاں
ساری چیزوں کو حیرت سے تکتی ہو تم
اچھی لگتی ہے مجھ کو تمھاری ذہانت
تجسس
مگر
یہ سڑک ہے
یہاں حادثے ہوتے ہیں

میں یہ کہتا نہیں
اپنی رفتار کو تم گھٹالو
مگر خود کو ان حادثوں سے بچالو
میں یہ کہتا نہیں اپنی رفتار کو تم گھٹالو
کیونکہ آہستہ چلنے سے اب فاصلے طے بھی ہوتے نہیں
زندگی دوڑ ہے
اس لیے دوڑ کر منزلوں سے ملو
اُڑ کے چھو لو فلک
چاند بن کر کھلو
ذہن و دل میں تمہارے بہت نور ہے
مجھ کو معلوم ہے
میں اگر چلتے چلتے کہیں بجھ گیا
تو کسی جھلملاتے ستارے میں روشن رہوں گا تمہارے لیے
تم کو کاندھے پہ اپنے اُٹھائے ہوئے
ٹافیاں جیب میں کچھ چھپائے ہوئے

شازیہ، میری تیسری بیٹی۔

عائشہ

ننھی سی تتلی
بیٹھی ہوا پر
اُڑتی ہے چاروں طرف
احساس اُس کا
خوشبو کے جیسا
مہکی ہے چاروں طرف
ساری دشائیں
ہوں اُس کی بانہیں
چھو لے وہ سارا جہاں
منزل کی مانند
ہو جائیں روشن
اس کے قدم کے نشاں

عائشہ، میری چوتھی بیٹی۔

میں صدف ہوں

گھر سے اک دن باہر نکلی
گھر کا رستہ بھول گئی
بازو والی بلڈنگ کے
واچ مین نے ہاتھ پکڑ کر
پاس بٹھایا
پرتیچے مانگا
لیکن میرے چہرے پر پہچان نہیں تھی

سارے نام تڑے مڑے تھے

میرا بھی

امی کا بھی

ابو کا بھی

کچھ اچھے انسانوں نے

ان کے اُن کے ہاتھوں سے

مجھ کو پولس چوکی تک پہنچایا تھا

میں نے سب سے باری باری پوچھا تھا

میری امی کب آئے گی

میرے ابو کب آئیں گے

مجھ کو اپنے گھر جانا ہے

صدف، میری دوسری بیٹی، جب وہ پونے تین سال کی تھی، ایک دن بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں کھیلتی ہوئی باہر سڑک پر چلی گئی اور بھیڑ میں کھو گئی۔

باتیں اگر دہرائی نہیں گئی ہوتیں تو ختم ہو گئی ہوتیں۔

حضرت علیؓ

♦

ایک سینگ دو سر رہتے تھے
ہم بھی دیکھ کے ڈر رہتے تھے

بلی چھت پہ سو جاتی تھی
ہم کمرے میں مر رہتے تھے

جمعہ کو چھٹی رہتی تھی
تختی بستہ دفتر رہتے تھے

چھوٹے چھوٹے ہاتھ ہمارے
طاق بہت اوپر رہتے تھے

خوابوں میں اندیکھے منظر
آنکھوں کے اندر رہتے تھے

جنگل میں مچھلی رہتی تھی
پانی میں بندر رہتے تھے

یاد جب بارش ہوتی تھی
کبھی کبوتر گھر رہتے تھے

کھیتوں میں رہٹیں چلتی تھیں
ہرے بھرے منظر رہتے تھے

بھرا بھرا اک دودھ کٹورہ
ملے گئے بستر رہتے تھے

گردن میں اک غلیل لٹکتا
جیبوں میں کنکر رہتے تھے

پورا دن بس کھیل تماشہ
ہاتھ پاؤں پتھر رہتے تھے

♦

ہم سب جھگڑا کیوں کرتے ہیں
پھر مل جایا کیوں کرتے ہیں

نانی اتنی سیدھی کیوں ہے
ماموں غصہ کیوں کرتے ہیں

گھر آتے کتا بلی کو
مار بھگایا کیوں کرتے ہیں

جامن خود ہی پک جاتی ہے
آم پکایا کیوں کرتے ہیں

ہم کھانا کھانے سے پہلے
یہ بسم اللہ کیوں کرتے ہیں

دن بھر پڑھنا کیوں پڑتا ہے
رات میں سویا کیوں کرتے ہیں

◆

ہاتھ کھینچا اور پتھر چھوٹا
کتیا بچ گئی برتن ٹوٹا

بلّی دودھ پیے چوری سے
کتّا کھانا کھائے جھوٹا

اپنی اپنی گولی چن لو
بھاگو بیل کا اُکھڑا کھونٹا

رات پہاڑ ہوئی لوگوں پر
گاؤں میں ایک پٹاخہ چھوٹا

روزانہ اسکول آئیں گے
حافظ جی سے وعدہ جھوٹا

◆

بارش زیادہ ہو تو اچھا رہتا ہے
پورے دن اسکول میں تالا رہتا ہے

بارش کی راتیں ہوتی ہیں جگنو کی
سارا منظر خواب کے جیسا رہتا ہے

لالٹین کو پوری رات جلاتے ہیں
بارش میں سانپوں کا خطرہ رہتا ہے

ندی سے تالاب میں مچھلی آتی ہے
دھان کے کھیت میں پانی پھیلا رہتا ہے

گنّے کچھ اوپر جا کر تھک جاتے ہیں
آسمان پہ بانس کا سایہ رہتا ہے

مچھر دانی آجاتی ہے پانی میں
گاؤں کا ہر گھر مچھلی والا رہتا ہے

ہم تو باہر جا کر گھومتے پھرتے ہیں
سورج دن بھر گھر میں بیٹھا رہتا ہے

♦

لوگ یونہی سویا کرتے تھے
ہم باہر چیخا کرتے تھے

پاگل[1] اور آئس پائس[2] میں
رات رات جاگا کرتے تھے

مسجد میں جنات نہیں تھے
ہم چھپ کر دیکھا کرتے تھے

جادو ٹونے والی ہنڈیا
رستے میں توڑا کرتے تھے

نیکر کھونٹی کو پہنا کر
ہم ننگے گھوما کرتے تھے

ایک کبڈی کھیل کہ جس میں
مردوں کو زندہ کرتے تھے

گاؤں میں جب دھوبی آتا تھا
کیچڑ کو گھوڑا کرتے تھے

۱۔ ۲۔ آنکھ مچولی جیسے دو مختلف کھیل، جو عموماً رات میں کھیلے جاتے ہیں۔

♦

چھت توڑوں، طوفان کروں
نانی کو حیران کروں

جھوٹ کہوں اور جھوٹ کے ساتھ
اللہ اور قرآن کروں

گنّے چوسوں کھیتوں میں
گھر میں کُل رمضان کروں

باہر بارش ہوتی ہے
گھر کو ہی میدان کروں

پھول چراؤں گملے سے
گڑیا کو گلدان کروں

چاند کو لاؤں کھانے پر
تاروں کو مہمان کروں

ساتھی ڈھونڈوں ایک نیا
اور اُسے فیضان[1] کروں

1۔ میرا بچپن کا دوست، جسے قتل کر دیا گیا۔

ماچس بارو[1] تو بڑتی[2] ہے
گھر میں اک بتی جڑتی[3] ہے

بلّی سے چوہے ڈرتے ہیں
نانی سے بلّی ڈرتی ہے

کھلیانوں میں زہر دھرا ہے
روز کوئی مرغی مرتی ہے

چرواہا چھپ کر بیٹھا ہے
بھینس کھڑی فصلیں چرتی ہے

پھولوں کو صندوق میں رکھ دوں
تتلی رس چوسا کرتی ہے

ہم سے نیچا آسمان ہے
گیند سے کچھ چھوٹی دھرتی ہے

چیونٹوں کی بارات آئے تو
گوریا پانی بھرتی ہے

۱۔ جلاؤ۔ ۲۔ ۳۔ جلتی۔

♦

ایک تھا راجہ ایک تھی رانی
چھوڑو ہو گئی بات پرانی

ایک پری تھی اک شہزادی
ان کی بھی تھی خوب کہانی

کتنے پیارے پیارے قصے
کہتی تھی بچپن میں نانی

بچپن بھی تھا کتنا پیارا
آتی تھی کیا نیند سہانی

گاؤں کو کھو کر پچھتائے ہم
گاؤں کی قیمت بعد میں جانی

♦

کیا بولوں کتنی اچھی تھی
میری نانی ماں جیسی تھی

درد سمجھ لیتی تھی میرا
مجھ سے پہلے وہ روتی تھی

ساری رات مرے کمرے میں
وہ اک بتی سی جلتی تھی

میری خوشیوں کی خاطر وہ
کیا جانے کیا کیا کرتی تھی

میرے لیے وہ ساری دنیا
اپنی جیبوں میں رکھتی تھی

میں کھیلوں اسکول سے چھپ کر
میری کتابیں وہ پڑھتی تھی

میں بچہ ہوکر سیانا تھا
وہ بوڑھی ہوکر بچی تھی

♦

ہم کو دیکھ کے گھبراتی ہے
کُتیا اکثر لنگڑاتی ہے

شیر کی اک تصویر ہے گھر میں
بلّی دیکھ کے ڈر جاتی ہے

طوطا پنجرے میں رہتا ہے
مینا باغ میں پھل کھاتی ہے

بیل، بھینس گھر میں رہتے ہیں
بکری کھیت میں چر آتی ہے

ہم جب گھر سے باہر ہوں تو
گوریا گانا گاتی ہے

◆

دیوار و در میں رہتے تھے
رات کو سب گھر میں رہتے تھے

پیڑوں پر بھوتوں کے سائے
بڑے مزے ڈر میں رہتے تھے

نیند بلا کر لے آتی تھی
خواب سمندر میں رہتے تھے

رنگ سبھی من بھانے والے
تتلی کے پر میں رہتے تھے

بستہ ٹیبل یا کھونٹی پر
کپڑے ہنگر میں رہتے تھے

گولی، لٹو، گلی ڈنڈا
کھیل سبھی سر میں رہتے تھے

آنکھیں رہتی تھیں مکتب میں
دھیان کبوتر میں رہتے تھے

♦

کپڑے میلے کم ہوتے تھے
جب ہم مٹی پر سوتے تھے

تعبیروں سے کام نہیں تھا
آنکھوں میں سپنے بوتے تھے

ننھے ننھے دو ہاتھوں نے
سوئے سوئے ہل جوتے تھے

چاندی جیسے تھے سب موسم
راتیں کوئل دن توتے تھے

پاگل تھے تتلی کے پیچھے
سارا سارا دن کھوتے تھے

ہنستے تھے سب کھیل تماشے
تختی اور بستہ روتے تھے

نانی پیار سے سمجھاتی تھیں
ماموں کچھ برہم ہوتے تھے

فراق گورکھپوری نے 'روپ' اور جاں نثار اختر
نے 'گھر آنگن' میں گھریلو زندگی کی مرقع کشی
کی تھی، لیکن یہ رباعیوں کے مجموعے ہیں،
مزید یہ کہ عشق و محبت، حسن ونشاط، کیف و مستی
اور گھر گرہستی کی بات دوسری ہے، اور بچپن کا
کھلنڈرہ پن، دُکھ درد اور گاؤں دیہات
قصبات کا زمینی پن بالکل الگ کیفیت ہے
اور اَن چھوا موضوع ہے۔ مقابلہ یوں بھی
مقصود نہیں بڑوں کی بات بڑی ہے۔ تاہم
شکیل اعظمی نے یک موضوعی نظموں کا
بچپن نامہ لکھ کر ایک نئی راہ میں سبقت کی ہے۔
— پروفیسر گوپی چند نارنگ
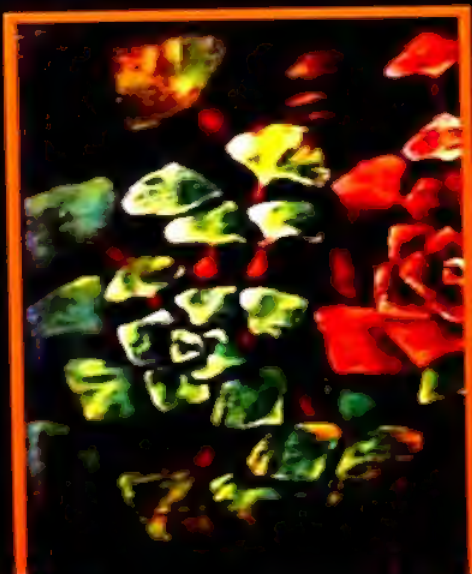
شکیل اعظمی اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے اپنے ننھیالی گاؤں 'سہریا' میں ۲۰؍اپریل ۱۹۷۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن اعظم گڑھ کا ہی ایک موضع 'سید حا سلطان پور' ہے، ان کے والد کا نام وکیل احمد خان اور والدہ کا نام ستار النساء خان ہے۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ان کی نانی نے کی۔ وہ مکتب پڑھ کر بمبئی چلے آئے اور پھر گجرات کے شہر بڑودہ چلے گئے۔ دو سال بڑودہ میں اور دو سال بھروچ میں رہنے کے بعد وہ سورت آگئے اور یہاں دس برس گزارے۔ ۱۹۸۴ء میں انھوں نے پہلی غزل بڑودہ میں کہی لیکن ان کی شاعری سورت میں پروان چڑھی۔ فروری ۲۰۰۱ء میں وہ دوبارہ بمبئی آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی شاعری کے اب تک پانچ مجموعے، دھوپ دریا (۱۹۹۶ء) ایش ٹرے (۲۰۰۰ء) راستہ بلاتا ہے (۲۰۰۵ء) خزاں کا موسم رکا ہوا ہے (۲۰۱۰ء) مٹی میں آسمان (۲۰۱۲ء) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ 'پوکھر میں سنگھاڑے' ان کی نظموں کا چھٹا انتخاب ہے جو ان کا سوانحی بچپن نامہ ہے۔ یہ کتاب ادبی حلقوں میں اپنے موضوع کی انفرادیت اور مواد کے اچھوتے پن کے اعتبار سے اُردو کی نظمیہ شاعری میں ایک خوشگوار اضافہ سے تعبیر کی جارہی ہے۔ شکیل اعظمی کو ان ہی کتابوں پر مختلف اُردو اکادمیوں سے دس انعامات مل چکے ہیں۔ وہ ایک لاکھ روپے کے کیفی اعظمی ایوارڈ سے بھی نوازے جا چکے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کے شعراء میں انہیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ انہوں نے فلم، ٹی وی اور کئی پرائیویٹ البم کے لیے بھی نغمے تحریر کیے ہیں۔ وہ ترا نام تھا، مدہوشی، زہر، نظر، وہ لمحے، دھوکہ، دھوم دھڑاکہ، تھری، شوبز، یو آر مائی جان، تیزاب۔ دی ایسڈ آف لو، لائف ایکسپریس، EMI، ہانٹیڈ، 1920 ایول ریٹرنس، کر لے پیار کر لے، یا رب، وغیرہ اُن کی خاص فلمیں ہیں۔ فلم 'مدہوشی' کے گیت 'اے خدا تو نے محبت یہ بنائی کیوں ہے' کے حوالے سے انہیں اسٹارڈسٹ ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ ان کی شہرت کا دائرہ ادب سے فلم تک اور فلم سے مشاعرے تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ خواص میں جتنے ممتاز ہیں عوام میں اتنے ہی مقبول ہیں

—— ادارہ

Pokhar Mein Singhade (Poetry)
by Shakeel Azmi

arshia publications

arshiapublicationspvt@gmail.com